بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا سعد صاحب دامت برکاتہم کی لہرپور سیتاپور ۱۴۳۵ھ میں اجتماع کے موقع پر کی گئی بعض تقریروں کے چند اقتباسات کا مختصر جائزہ

(۱) جدید آلات اور رواجی چیزوں کے ذریعہ تبلیغ

تمہید: تمام اسلاف متقدمین ومتاخرین، فقہاء ومحدثین یہ لکھتے چلے آرہے ہیں، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی ایک مضمون میں اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ شریعت میں دو چیزیں ہیں وسائل اور مقاصد، مقاصد میں جن امور میں شریعت نے خاص طریقہ متعین کر دیا ہے ان میں تغیر وتبدیل کی گنجائش نہیں، جیسے نمازوں کی کمیّت وکیفیت، رکعتوں کی تعداد وغیرہ جن کو فقہاء نے امر تعبدی سے تعبیر کیا ہے، اور شریعت کے بہت سے احکام ایسے ہیں کہ ان میں کسی خاص طریقہ کا شریعت نے پابند نہیں کیا، بلکہ اس کے حدود وقیود مقرر کر دیئے ہیں، مثلاً لباس کی وضع قطع کہ اس میں شریعت نے اختیار دیا ہے البتہ کچھ حدود مقرر کیے ہیں مثلاً ٹخنوں سے نیچا نہ ہو، گھٹنوں سے اونچا نہ ہو وغیرہ وغیرہ وسائل اور اسباب کے متعلق شریعت نے لوگوں کو زمانہ اور حالات کے اعتبار سے اختیار دے رکھا ہے، اور قدیم صالح کے ساتھ جدید نافع کے اختیار کرنے کی نہ صرف اجازت بلکہ سیرت نبویہ سے عملی ترغیب بھی معلوم ہوتی ہے، شرعی ضرورت کے وقت بسا اوقات جدید نافع کو اختیار کرنا ضروری بھی ہو جائے گا۔

فقہاء اسلام اور حضرت مولاناؒ کی تصریح کے مطابق جہاد اور اس کے جملہ انواع، اسی طرح دعوت وتبلیغ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، تعلیم وتبلیغ اور تزکیہ سب اسی دائرہ میں آتے ہیں کہ لوگوں کے حالات کے لحاظ سے طریقوں میں تغیر وتبدل سب ممکن ہے، کسی خاص حالت اور طریقہ کی پابندی امر اول کی طرح لازم نہیں۔ اور جدید رواجی طریقوں اور جدید آلات کو اختیار کرنا مذموم نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جہاد تیر وکمان کے ذریعہ ہوتا تھا اور اب دیگر آلاتِ حرب کے ذریعہ ہوتا ہے اور یہی ضروری ہے، اسی طرح تعلیم وتبلیغ وتزکیہ میں بھی شریعت نے حدود وقیود اور آداب تو بتائے ہیں باقی ضرورت کے تحت حالات کے پیش نظر جدید آلات اور رواجی طریقوں کو اختیار کرنے کی بالکل اجازت دی ہے۔

اور ندوۃ العلماء کے مسلک کی تو بنیاد ہی قدیم صالح اور جدید نافع پر ہے، یہ تو ہے شرعی ضابطہ کی بات، جس کے دلائل کتب شرعیہ میں مفصلاً مذکور ہیں۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ارشاد فرماتے ہیں :

''اللہ کی طرف اور اس کے دین کی طرف بندوں کو بلانا فرض ہے، انفرادی ہو یا اجتماعی، تقریر سے ہو یا تحریر سے، علانیہ ہو یا خلوت میں، اس کی کوئی شکل متعین نہیں دعوت دین کا کام کرنے والے ہر فرد جماعت کو اختیار ہے کہ وہ جس ماحول میں اپنے لئے جو

طریقہ صحیح جانے وہ مقرر کرلے اور اپنی سعی وجدوجہد کا جو طرز مناسب اور مفید سمجھے وہ اختیار کرے اس میں کسی کو جائز اور ناجائز کہنے یا کوئی روک ٹوک لگانے کا حق حاصل نہیں ہے، جب تک کہ اس میں ایسا کوئی عنصر شامل نہ ہوجائے جو شرعی طور پر منکر یا مقاصد دینیہ کے لئے مضر ہو، یہ سب چیزیں اجتہادی اور تجرباتی ہیں، ان چیزوں پر یا ان خاص شکلوں پر ہر جگہ اور ہر شخص سے منصوص چیزوں کی طرح اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

کبھی کبھی ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ایک طبقہ یہ سمجھنے لگا ہے کہ یہی طریقۂ کار اور یہی طرز، دین کی خدمت اور احیاء کے لئے ہمیشہ کے واسطے اور ہر جگہ کے لئے ضروری ہے اور اس کے علاوہ سب غلط ہے، جب تک اس مخصوص طریقہ پر کام نہ ہو تو سمجھا جاتا ہے کہ ساری جدوجہد رائیگاں گئی اور جو کچھ ہوا سب فضول ہوا، یہ بے اعتدالی ہے اور یہ رویہ خطرناک ہے، اسی طرز فکر کے نتیجہ میں مختلف مذاہب اور فرقے امت میں پیدا ہوئے، اصل حقیقت صرف اتنی ہے کہ اب تک اور تجربوں نے ہمیں یہاں تک پہنچایا اور ہم نے اس کو مفید پایا ہے، پس جب تک یہ چیزیں فائدہ مند معلوم ہوتی ہیں اس وقت تک ان کو جاری رکھنا چاہئے، لیکن اگر کوئی خاص طریقہ ایک رسم بن جائے تو یہ ایک مذہب بن جائے گا اور ایک بدعت قائم ہوجائے گی، اور اس وقت کے ربانی مصلحین کا فرض ہوگا کہ اس کی اصلاح کے لئے جدوجہد کریں اور ان رسومات کو مٹائیں، بہت سی چیزیں صحیح مقاصد اور دینی مصلحتوں سے شروع ہوتی ہیں لیکن آگے چل کر غلط صورت اختیار کرلیتی ہیں ایسے موقع پر حقیقت ورسم، سنت وبدعت، فرض ومباح میں تمیز کرنا تفقہ فی الدین ہے۔''

(تبلیغ دین کے لئے ایک اصول، ملحقہ خطبات علی میاں ص۴۴۲، ۴۴۴، ج۵)

یہ تو ہوئی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وضاحت جو ٹھیک کتاب وسنت کے مطابق ہے،

اب دیکھئے حضرت مولانا سعد صاحب دامت برکاتہم لاکھوں کے مجمع میں کیا بیان فرماتے ہیں، انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو! فرماتے ہیں :

''بات کا پہونچا دینا یہ تبلیغ نہیں ہے بلکہ خود دعوت کو لے کر جانا، دل میں اتارنا یہ دعوت ہے، نشر واشاعت کے ذریعہ، آلات کے ذریعہ دعوت کا پہنچا دینا اتمام حجت کے لیے کافی نہیں، ہر طریقۂ ابلاغ دعوت نہیں ہے، دعوت صرف اسی طریقہ پر ہوتی ہے جس کو صحابہ کرام کرتے تھے، انفرادی دعوت اصل دعوت ہے اور غیبی نصرت وہدایت کا سبب ہے، کسی ذریعہ سے دعوت کا پہنچا دینا اتمام حجت کے لیے ہرگز کافی نہیں، آج ہم نے رواجی طریقوں کو کافی سمجھ لیا ہے یہ نہ اپنی ہدایت کے لیے کافی ہے نہ دوسروں کے لیے، دعوت تو صرف اس کو کہتے ہیں جو صحابہ کے طریقہ کے مطابق ہو، اس زمانہ کے رواجی طریقے صحابہ کے دور میں نہ تھے کہ موقع آیا تو اخبار میں ایک کالم لکھ دیا، رواجی طریقوں سے دین کا پہنچا دینا رواج کی ترقی کا ذریعہ ہوگا، دین کی ترقی کا ذریعہ نہ ہوگا، دعوت صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے طریقہ کو کہتے ہیں، صحابہ کرام کے طریقۂ محنت کو دعوت کہتے ہیں، سب سے پہلے امت سے سنت دعوت ختم ہو جائے گی، رواجی طریقوں اور نشر واشاعت کے ذریعہ دعوت دینے کو کافی سمجھ لیا یہ ہرگز کافی نہیں، اب تو سارے دین کی اشاعت

آلات پر ہے اوراس کوترقی سمجھتے ہیں، دعوت خط وکتابت سے نہیں ہے دعوت جماعت سے ہے، رواجی طریقے اللہ واسطے سب چھوڑ دواوردین کی دعوت خود لے کر پہنچو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکام کوخطوط لکھے ڈاک سے نہیں بھیجے صحابہ کی جماعت بھیجی''

''جتنا رواجی چیزوں سے بچوگے اللہ تعالیٰ طریقہ الہام کریں گے، اور جتنا رواجی چیزوں کواختیار کروگے سنتِ دعوت سے دور ہوتے چلے جاؤ گے، امور دعوت اس شخص کوالہام ہوں گے جورواجی چیزوں سے پرہیز کرے گا ایک صاحب نے فیکس مشین رکھنے کے لیے مجھ سے کہا، میں نے ان کولکھا کہ امور دعوت اس شخص کوالہام ہوں گے جورواجی چیزوں سے پرہیز کرے گا.....

(اذان کی ابتداء اوراس کی مشروعیت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ارشادفرمایا) صحابہ نے مشورے دیئے آپ نے فرمادیا یہ یہودیوں کا طریقہ ہے، اذان الہام ہوئی، دعوت تامہ الہام ہوئی ہے رواجی طریقوں کے چھوڑنے کی وجہ سے''

اسی سیاق میں یہ بھی فرمایا کہ ''سب سے زیادہ نقصان موبائل سے پہنچا ہے کہ موبائل کے ذریعہ مشورہ دینے اوردعوت دینے کو کافی سمجھ لیا، خود جاکر دعوت دو''

مرکز کے دوسرے صاحب نے ایک بیان میں فرمایا:

''پہلے دعوت ہے بعد میں عبادت، دیکھواذان پہلے ہے جس سے شیطان بھاگتا ہے نماز بعد میں ہے، شیطان پھرآکر نماز میں بہکانے لگتا ہے، پہلے دعوت بعد میں عبادت''

مذکورہ بالامضمون میں محترم مولانا سعد صاحب نے اپنے مغرب کے بعد کے بیان میں تین مرتبہ پوری قوت سے بیان فرمایا جس کواحقر نے سنااور بروقت ضبط کیا، حضرت والاسمجھ سکتے ہیں کہ ان کی ان مذکورہ باتوں سے لاکھوں کے مجمع پر کیا اثر پڑا ہوگا،

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تذکیر وتبلیغ میں ترغیب وترہیب اور ذہن سازی وتربیت کے لیے ایک حدتک غلوکو بھی گوارہ کرلیا جاتا ہے، اورمعزز شخصیت کے اقوال کی توجیہ وتاویل بھی گوارہ کی جاتی ہے، یہاں بھی کھینچ تان کرہم تاویلات کرسکتے ہیں، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ان کا یہ منفی اندازِ بیان، یاان کے بیان کے منفی اثرات امت کے لاکھوں افراد پر کیا پڑ رہے ہیں؟ کیا جدید آلات اورمختلف ذرائع ابلاغ نیز تصنیف وتالیف اورخط وکتابت کے ذریعہ تبلیغ، تبلیغ نہیں ہے؟ نشرواشاعت کیا تبلیغ کا مؤثر اور پائیدار طریقہ نہیں ہے؟ بَلِّغْ مَاأُنْزِلَ میں مَاأنزل کا دائرہ کس قدر وسیع ہے کیا اس وسعت کے ساتھ دین کے سارے امور کی تبلیغ تصنیف وتالیف کے بغیر آج کل ممکن ہے؟ اِنْ عَلَیْکَ اِلَّاالْبَلَاغ فرمان خداوندی کے تحت کیا بہت سے موقعوں میں محض ابلاغ سے حق تبلیغ ادانہیں ہوگا؟ عمر بن عبدالعزیزؒ کے مکاتیب اور مجدد الف ثانیؒ کے خطوط جوانہوں نے حکام کوارسال کیے اورحضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے عرب وعجم کے حکام کو جودعوتی خطوط لکھے کیا وہ تبلیغ نہیں ہیں؟ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ ریڈیو اسٹیشن پاکستان کے ذریعہ درس قرآن دیا کرتے تھے اورآج بھی عرب وعجم کے مختلف ممالک میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں اہل علم جدید آلات، جدید ذرائع ابلاغ ومواصلات جن کورواجی چیز کہا جاتا ہے ان کے ذریعہ دین وشریعت کی مؤثر خدمات انجام دے رہے ہیں اوران

کے ذریعہ تبلیغ دین کر رہے ہیں کیا یہ سب رواج کی ترقی کا ذریعہ ہیں؟ اور دین کی ترقی اور تبلیغ ان سے نہیں ہو رہی؟ کیا ان سب طریقوں سے سنت سے دوری ہوئی اور سنت دعوت ختم ہوگئی؟

غور طلب بات یہ ہے کہ سامعین جو لاکھوں کی تعداد میں تھے کیا ان کے قلوب میں یہ بات راسخ نہیں ہوئی کہ تصنیف وتالیف ودیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعہ علماء جو خدمات انجام دے رہے ہیں وہ تبلیغ نہیں ہے! اصل تبلیغ یہ ہے جو خود جا کر بالمشافہہ ہم دے رہے ہیں، اسلاف دعاۃ اور علماء سے دوری اور بدگمانی بلکہ بدزبانی کی راہ رفتہ رفتہ ہموار ہو رہی ہے کہ اصل دعوت تو بس یہی ہے جو ہم کر رہے ہیں باقی رواجی طریقے سب بیکار ہیں۔

لاکھوں سامعین کا مجمع تو یہ سمجھ رہا ہے کہ مولانا سعد صاحب جو بیان فرما رہے ہیں یہ سب اللہ کی طرف سے الہام کیا ہوا ہے گویا منزل من السماء ہے کیوں کہ انہوں نے رواجی چیزوں کو چھوڑ دیا ہے، جس طرح رواجی چیزوں کے چھوڑنے سے اذان جیسی دعوت تامہ کا الہام ہوا، اسی طرح اس زمانہ میں ان طریقوں کا الہام ہوا، اس خاص طریقہ تبلیغ پر اصرار اور دوسرے طرق جو دیگر ذرائع ابلاغ کے واسطہ سے ہو اس کی نفی کا ذہن بن رہا ہے، شریعت نے جن چیزوں میں اپنے بندوں کو اختیار دیا تھا (یعنی طرق دعوت میں) ان کے بیان سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس اختیار کو سلب کر کے خاص ایک طریقہ کی پابندی لازم اور ضروری ہے، بعد میں چند جملوں میں یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ دوسرے شعبے مدرسے وغیرہ بھی ضروری ہیں.....لیکن اصل پختہ ذہن وہی بنتا ہے۔

رواجی چیزوں کو چھوڑنے سے اذان جیسی دعوت کے ملہم ہونے کی بات بھی محل غور ہے، یہ دقیق علمی غلطی ہے، کیا اذان اس معنی کر دعوت ہے جس معنی کر وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ دعوت تامہ اذان کا ایک لقب ہے۔

دعوت وتبلیغ میں تو ہم مختار ہیں، طریقہ میں تغیر وتبدل اور کمیت میں کمی بیشی اور ہیئت میں تبدیلی سب کر سکتے ہیں، کیا اذان میں مثلاً ضرورت کے وقت فجر کی اذان میں لوگوں کے غلبۂ نیند کے وقت **الصلوٰۃ خیر من النوم** بجائے دو کے چار بار کہہ سکتے ہیں؟ یا لوگوں کی غفلت کے وقت حی علی الصلاۃ کا مزید تکرار واعادہ کر سکتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ اس معنیٰ کر اذان دعوت نہیں ہے بلکہ امر تعبدی اور خالص عبادت ہے اسی وجہ سے اس میں کمی وبیشی اور تغیر وتبدل کا حق نہیں۔ جب تک اس امر تعبدی کا حکم اور اس کی مشروعیت نہ ہوئی تھی تو اس مقصد کے لیے مشورہ بھی ہوا، اب مشورہ سے بھی اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

نماز پر اذان کی تقدیم کی وجہ سے یہ کہنا کیسے درست ہوا کہ پہلے دعوت بعد میں عبادت، مشروعیت کے لحاظ سے تو پہلے نماز ہے بعد میں اذان، اور اذان سے پہلے تعلیم اذان ہے تو ان صاحب کو یہ کہنا چاہئے کہ پہلے تعلیم بعد میں دعوت۔ آخر ایسے نکتے کیوں بیان کیے جائیں جو علمی اعتبار سے بھی غلط ہوں اور خواہ مخواہ موضوع بحث بنیں۔ رواجی اور جدید آلات سے احتراز اور پرہیز ضروری ہے کیوں کہ صحابہ کے زمانہ میں بقول ان کے یہ سب طریقے نہیں تھے، فیکس نہیں تھا، موبائل نہیں تھا، تو پھر رواجی طریقوں اور چیزوں اور جدید آلات میں لاؤڈ اسپیکر بھی ہے، ان کی بیان کردہ ہدایت وتاکید کے مطابق جلسوں میں اور بڑے بڑے اجتماعات میں اس کا بھی

استعمال نہ ہونا چاہئے کیوں کہ صحابہ کے زمانہ میں لاؤڈ اسپیکر نہیں تھا اس کو استعمال کرنے سے سنت دعوت سے دوری ہوگی اور دین کی ترقی نہیں بلکہ رواجی چیزوں کی ترقی ہوگی۔ان کی ان باتوں کو سن کر لاکھوں کا ذہن کیا بنا اور اس سے کیا نتائج نکلے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

(۲) کیا موبائل میں کلام پاک سننا اور پڑھنا قرآن کی توہین، اور اس کی تصاویر قطعی حرام ہیں؟

حضرت مولانا سعد صاحب نے لہر پور کے اجتماع میں مغرب کے بعد بیان میں ارشاد فرمایا:

''موبائل سے تصویر لینا قطعی حرام ہے، اس کی حرمت میں کوئی دورائے نہیں، شکل بدلنے سے حکم نہیں بدلتا مجھے اس سے بہت نفرت ہے، خدانہ کرے مجھ سے بددعاء نکل جائے، یہ سب شیطان کے مشورے ہیں کہ حرام کو حلال کردے، شکل بدلنے سے حکم نہیں بدلتا، جس کے موبائل میں تصویر ہو اس کو نکال دے ورنہ وہ نقصان اٹھائے گا، جس موبائل میں تصویر ہوگی وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آئیں گے۔

اسی طرح موبائل میں قرآن پاک کا سننا اور پڑھنا یہ قرآن پاک کی توہین ہے۔ (بطور دلیل کے بیان فرمایا) وحی کا اتنا بوجھ تھا.....لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ.....اگر قرآن پہاڑ پر نازل کیا جاتا تو پہاڑ ریزے ریزے ہوجاتا.....اس قرآن پاک کو موبائل میں سنیں، کیسے طبیعت گوارہ کرتی ہے؟''

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا کے اس بیان سے لوگوں نے اس کا بہت اثر لیا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حقیقت یہی ہے اور شرعی حکم بھی یہی ہے جس کو مولانا نے لاکھوں کے سامنے بیان کیا اور بطور شرعی مسئلہ کے لوگوں نے سمجھ بھی لیا؟ کیا قرآن پاک کا موبائل یا کسی جدید آلہ میں دیکھنا، سننا، پڑھنا قرآن پاک کی توہین کو مستلزم ہے؟ موبائل کی تصویر قطعی حرام ہے اس میں کوئی دوسری رائے نہیں؟ کیمرے اور کاغذی تصاویر کی بابت تو کہا جاسکتا ہے کہ علماء مصر کے علاوہ عرب وعجم کے تمام معتمد علماء اس کے عدم جواز پر متفق ہیں، لیکن موبائل، سی ڈی، کمپیوٹر وغیرہ آلات میں نمودار ہونے والی تصاویر جس میں کاغذ وغیرہ کی طرح تصاویر کا انضباط وتحفظ نہیں ہوتا اور اس معنی کر نہ وہ پائیدار ہے نہ مرئی، بلکہ یہ اس آلہ کا کمال ہے کہ وہ بروقت سابقہ واقعہ کی منظر کشی پورے طور پر کردیتا ہے ورنہ خود اس آلہ کے اندر کوئی تصویر نہیں، یہ بعض علماء کی رائے ہے وہ حضرات ایسی تصاویر کو جائز کہتے ہیں، البتہ عرب اور عجم کے علماء کی ایک جماعت اس کو بھی ناجائز کہتی ہے۔

الغرض اہل حق علماء کا اختلاف بھی ہے پھر اس کو قطعی حرام اور یہ کہ اس میں کوئی دورائے نہیں کیسے کہا جاسکتا ہے؟ یہ محض لفظی گرفت نہیں بلکہ عوام نے یہ اثر لیا کہ بڑا طبقہ اس کو بالکل ناجائز سمجھنے لگا، اب اگر کوئی عالم، دیندار اس میں مبتلا نظر آئے وہ اس سے بدگمان ہوتے ہیں کہ یہ حرام میں مبتلا ہیں۔اگر کوئی موبائل میں قرآن پاک سن رہا ہے یا دیکھ کر پڑھ رہا ہے تو وہ قرآن کی توہین کر رہا ہے، چنانچہ دوسرے ہی دن سے فون آنے شروع ہوگئے کہ کیا موبائل میں قرآن پڑھنا اور سننا اس کی توہین ہے؟

موبائل میں قرآن پاک سننا، پڑھنا کس وجہ سے توہین کو مستلزم اور حرام ہے؟ کیا اس وجہ سے کہ یہ جدید آلہ ہے؟ یا اس وجہ سے کہ اس کا استعمال بکثرت فحش اور بے حیائیوں میں بھی ہوتا ہے، تو پھر چاہئے کہ لاؤڈ اسپیکر وغیرہ کا استعمال بھی ترک کر دیا جائے۔ اس میں بھی قرآن پاک سننا توہین سمجھا جائے، ہم نے تو اپنے بعض بڑوں کو، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو بڑے اہتمام سے رمضان شریف میں بعد عصر ٹیپ رکارڈ کے ذریعہ پابندی سے قرآن پاک سنتے دیکھا ہے، اس میں کوئی توہین کی بات نہیں، پھر مولانا نے جو دلیل دی ہے لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآن الخ اہل علم سمجھ سکتے ہیں کہ اس کو اس سے کیا مس! یہ ان کا اجتہاد و استنباط ہے یا ان کی طبعی و ذوقی چیز ہے، ذوقی چیز کو شرعی مسئلہ بنا کر امت کو کیوں پابند کر رہے ہیں، پھر اس قدر تنفر کہ بددعا کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔

(۳) قبولیت توبہ کی چوتھی شرط لوگ بھول گئے

اسی تقریر میں مولانا نے بیان فرمایا :

" نقل و حرکت توبہ کی تکمیل و تزکیہ کے لئے ہے، توبہ کی تین شرطیں تو لوگ جانتے ہیں..... چوتھی شرط نہیں جانتے بھول گئے وہ کیا ہے خروج، اس شرط کو لوگوں نے بھلا دیا، بطور دلیل کے مولانا نے بنی اسرائیل کا قصہ بیان فرمایا کہ ایک آدمی نے ۹۹ رقتل کیے تھے.....(پورا قصہ) پہلی ملاقات راہب سے ہوئی، راہب اس کو کہتے ہیں جو امت سے کٹ کر خلوت میں عبادت کرے..... پھر عالم سے ملاقات ہوئی، عالم نے کہا تم خروج کرو، اس قاتل نے خروج کیا اللہ نے اس کی توبہ قبول کی۔ معلوم ہوا کہ توبہ کے لیے خروج ضروری ہے۔"

مولانا دامت برکاتہم نے بنی اسرائیل کے ۹۹ رلوگوں کے قاتل کا قصہ بہت تفصیل سے بیان فرمایا اور پوری قوت سے اس بات کو ثابت کیا کہ وہ ۹۹ رلوگوں کا قاتل راہب کے پاس گیا تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوئی جب اس نے دوسری بستی کے لیے خروج کیا تب جا کر اس کی توبہ قبول ہوئی، معلوم ہوا کہ توبہ کے لیے اللہ کے راستہ میں خروج ضروری ہے، اس کے بغیر توبہ قبول نہیں ہوتی، یہ شرط لوگ بھول گئے، توبہ کی تین شرطیں بیان کرتے ہیں چوتھی شرط یعنی خروج کو بھول جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مولانا نے توبہ کی قبولیت کی چوتھی شرط خروج فی سبیل اللہ جو بیان کی جس کو علماء سلف و خلف اور فقہاء و محدثین بیان کرنا بھول گئے، یہ شرط کہاں سے ماخوذ ہے؟ قرآن پاک کی کس آیت یا کس حدیث سے یہ شرط مستفاد ہوتی ہے؟ کتاب و سنت سے تو اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

(۱) ترمذی شریف کی روایت ہے حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا آپ نے فرمایا جو شخص چھوٹا، بڑا کسی قسم کا کوئی بھی گناہ کرے پھر اٹھ کر وضو کرے، نماز پڑھے (یعنی صلوٰۃ التوبہ پڑھے) پھر استغفار کرے اللہ تعالیٰ اس کو بالکل معاف فرما دیتا ہے روایت کے الفاظ یہ ہیں **ما من رجل یذنب ذنبا ثم یقوم فیتطهر ثم یصلی ثم یستغفر الله الا غفر الله له**.....**رواه الترمذی** (مرقاۃ ج ۳ ص ۳۶۸ / باب التطوع)

(۲) قرآن پاک سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے، ارشاد خداوندی ہے:

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْيَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِاللّٰهَ يَجِدِاللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. (سورہ نساء پ۵/)

(ترجمہ) اور جو شخص کوئی برا کام کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے معافی مانگ لے تو وہ اللہ تعالیٰ کو بہت معاف کرنے والا اور مہربان پائے گا۔

اس آیت وحدیث میں مغفرت اور توبہ کی قبولیت کے لیے خروج کا اشارہ تک نہیں ہے۔

(۳) چھٹی صدی کے محقق بزرگ علامہ ابن قدامہ المقدسی رحمہ اللہ (المتوفی ۶۲۰ھ) نے اپنی کتاب ''کتاب التوابین'' میں نقل فرمایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں قحط پڑا، بارش رک گئی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بہت دعا کی بارش نہ ہوئی اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ کی جماعت اور مجمع میں ایک ایسا عاصی اور گنہگار بندہ ہے جو چالیس سال سے گناہ میں مبتلا ہے کہ اس کی وجہ سے بارش رکی ہوئی ہے جب تک وہ رہے گا اس کے ہوتے ہوئے بارش نہ ہوگی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعلان کیا جو ایسا نافرمان گنہگار بندہ ہو مجمع سے چلا جائے تاکہ بارش ہو جائے، اس کی وجہ سے پوری قوم کو تکلیف ہو رہی ہے، مجمع سے کوئی اٹھا بھی نہیں اور بارش بھی ہوگئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا یارب العالمین آپ نے فرمایا تھا کہ ایک ایسا نافرمان بندہ موجود ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے بارش نہ ہوگی، مجمع سے کوئی اٹھا بھی نہیں اور بارش ہوگئی! اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ میرا نافرمان بندہ تھا اس کے بعد اس نے فوراً تمام گناہوں سے توبہ کر لی اب وہ میرا نافرمان بندہ نہیں، فرماں بردار اور محبوب بندہ بن گیا، اس لیے بارش ہوگئی۔ **فأوحى اللّٰه اليه.....ولكن فيكم عبديبارزني منذاربعين سنة بالمعاصي فنادفي الناس حتى يخرج من بين اظهركم،فيه منعتكم.....فقال في نفسهٖ ان أنا خرجت من بين هذاالخلق افتضحت على رؤس بني اسرائيل، وان قعدت معهم منعوالاجلي فأدخل رأسه في ثيابه نادماعلى فعاله وقال:الهي وسيدي عصيتك اربعين سنة وامهلتني وقد اتيتك طائعافاقبلني فلم يستتم الكلام حتى ارتفعت سحابة بيضاء فأمطرت كأفواه القِرَب...** (کتاب التوابین ص۶۲، مطبوعہ بیروت لبنان)

دیکھئے یہاں مجمع سے نہوض اور خروج کچھ بھی نہیں ہوا بلکہ مجمع کے اندر ہی بیٹھے بیٹھے کپڑے کے اندر اپنے سر کو داخل کر کے اس نے توبہ کی اور توبہ قبول ہوگئی اس لیے سچی بات یہ ہے کہ توبہ کی قبولیت کے لیے خروج کو شرط قرار دینا بالکل غلط اور باطل ہے۔

(۴) حضرت ملا علی قاریؒ نے شرح مشکوٰۃ میں امام غزالی کے حوالے سے توبہ کا افضل واعلیٰ طریقہ نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب توبہ کا ارادہ ہو غسل کرو، اچھے کپڑے پہنو، صلوٰۃ التوبہ پڑھو، ایسی خلوت اور تنہائی کی جگہ میں کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی تم کو دیکھنے والا نہ ہو.....**وقال الغزالي في المنهاج اذااردت التوبة تغتسل واغسل ثيابك وصل ماكتب الله لك ثم ضع وجهك الارض في مكان خال لا يراك الا الله سبحانه وتعالى** الخ (مرقاۃ ج۳/ص۳۶۹/ باب التطوع)

دیکھئے حضرت امام غزالیؒ اور ملا علی قاریؒ تو توبہ کا افضل اور بہتر طریقہ یہ بتلا رہے ہیں کہ بالکل تنہائی میں، خلوت میں ہوکر صدق دل سے توبہ کرو، اللہ کے سوا کوئی تم کو دیکھنے والا نہ ہو۔ گھر کے کسی گوشہ اور اندر کے کمرہ میں بیٹھ کر توبہ کروگے تو بھی توبہ قبول ہوجائے گی، ہمارے اسلاف فقہاء، ومحدثین اور مفسرین میں سے کسی نے بھی توبہ کی قبولیت کے لیے خروج کو شرط قرار نہیں دیا۔

(۵) توبہ کے متعلق حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ معارف القرآن میں تحریر فرماتے ہیں :

'' توبہ کے لیے تین چیزیں ہونا ضروری ہیں، ایک گذشتہ گناہوں پر نادم ہونا، دوسرے جن گناہوں میں مبتلا ہو اس کو اسی وقت چھوڑ دینا اور تیسرے آئندہ کے لیے گناہ سے بچنے کا پختہ ارادہ کرنا، البتہ جن گناہوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے ان کو انہی سے معاف کرانا یا حقوق ادا کرنا بھی توبہ کی شرط ہے۔ (معارف القرآن جلد۲ ص ۳۴۳ ۵/ نساء پ ۵/)

توبہ کے متعلق حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے تمام شراح حدیث اور مفسرین بھی صدیوں سے یہی لکھتے چلے آرہے ہیں چنانچہ حضرت ملا علی قاریؒ شرح مشکوٰۃ میں تحریر فرماتے ہیں :

والتوبة فی الشرع ترک الذنب لقبحه، والندم علی مافرط منه، والعزیمة علی ترک المعاودة، وتدارک ماامکنه أن یتدارک ،من الأعمال بالاعادة...... وزاد النووی وقال ان کان الذنب متعلقا ببنی آدم فلها شرط آخر وهوردالمظلمة الی صاحبها أو تحصیل البرأة منه. (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ جلد۵ ص ۲۳۱/ باب الاستغفار والتوبۃ)

شراح حدیث کی تصریح کے مطابق توبہ کی حقیقت اور اس کے شرائط وہی ہیں جن کو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے بیان فرمایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے یعنی چودہ سو سال سے اب تک تمام اسلاف واکابر یہی لکھتے چلے آرہے ہیں اور اب محدثین ومفسرین کی تصریحات کے خلاف اتنی جسارت سے یہ کہنا کہ توبہ کے تحقق کی تین شرطیں لوگ بیان کرتے ہیں چوتھی جانتے نہیں بھول گئے، اس دعویٰ میں مفسرین ومحدثین اور تمام اسلاف واکابر سے کس قدر بے اعتمادی اور ان پر کتنا سخت الزام ہے کہ توبہ کی چوتھی شرط سے سب لوگ غافل رہے۔

مولانا کا یہ اجتہاد استنباط ناقابلِ قبول ہے کہ توبہ کے لیے چوتھی شرط یعنی خروج کو انہوں نے لازم قرار دیا، اور ساتھ ہی اس کی دلیل میں بنی اسرائیل کے ۹۹/ لوگوں کے قاتل والا قصہ ذکر فرمایا کہ بستی کی طرف جب اس نے خروج کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول فرمائی

شرّاح حدیث اور محققین کی تحقیقات وتصریحات کے خلاف اپنی فہم پر اتنا اعتماد؟ بالفرض اگر مولانا کے اس استدلال کو مدنظر رکھا جائے تو اس میں تو مسلم شریف کی حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں **انطلق الی أرض کذاو کذافان بها أناسایعبدون الله فاعبدالله معهم ولاترجع الی أرضک** (مرقاۃ ج ۵/ ص ۲۳۹/) کہ خروج کے بعد عابدوں کے پاس رہ کر قیام کرکے عبادت کرو، اس سے اصلاً خروج نہیں بلکہ عابدوں، زاہدوں کی صحبت میں رہ کر خانقاہوں میں جاکر رہنے کا ثبوت ہوتا ہے، بالفرض اگر شرط کہا جائے تو اس کو شرط کہنا چاہئے یعنی عابدوں کی معیت کو نہ کہ نفس خروج کو۔ واللہ اعلم

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی کسی آیت اور کسی حدیث سے بھی توبہ کی قبولیت کے لیے خروج فی سبیل اللہ کی شرط نہیں معلوم ہوتی، یہ شرط باطل، قرآن وحدیث کے خلاف ہے، اس شرط کی وجہ سے اللہ کے بندوں پر اللہ کی رحمت کو تنگ کرنے کا وبال اور اس کا گناہ لازم آتا ہے۔

ابوداؤد شریف کی کتاب الادب میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت موجود ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل میں دو شخص تھے ایک گنہگار دوسرا مجتہد فی العبادۃ ناصح، یعنی بہت عبادت کرنے والا جو بار بار اس گنہگار کو نصیحت کرتا تھا، ایک دن اس نے کہا **واللہ لایغفر اللّٰہ لک أو لایدخلک اللہ الجنۃ** یعنی بخدا اللہ تیری مغفرت نہ کرے گا یا تجھ کو جنت میں داخل نہ کرے گا، دونوں کا انتقال ہوا، اللہ نے دونوں کی روحوں کو جمع فرمایا اور عبادت گذار سے کہا أکنت بی عالما أو کنت علی مافی یدی قادراً ؟ یعنی کیا تم مجھ کو جانتے تھے کہ میں اس کی مغفرت نہ کروں گا، جو چیز میرے قبضہ وقدرت کی ہے یعنی مغفرت و معافی کیا تم اس پر قادر اور اس کے ٹھیکیدار تھے ؟ اس کے بعد اللہ نے حکم دیا کہ اس گنہگار کو جنت میں داخل کر دو! اور دوسرے کے بارے میں فرمایا اس کو دوزخ میں بھیج دو۔

حدیث کو نقل کرنے کے بعد حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں قسم اس پاک ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تکلم بکلمۃ اوبقت دنیاہ و آخرتہ اس عبادت گذار شخص نے اپنی زبان سے ایسی بات کہی جس کی وجہ سے اس نے اپنی دنیا و آخرت دونوں کو برباد کرلیا۔ (ابوداؤد، کتاب الادب، باب النہی عن البغی، بذل المجہود ج ۵ ص ۲۵۹)

واقعی بڑی قابل غور اور بہت ڈرنے کی بات ہے، توبہ کی قبولیت کے لیے خروج فی سبیل اللہ کی شرط لگانا درحقیقت یہ کہنا ہے کہ جب تک تم اللہ کے راستہ میں نہ نکلو گے اللہ تمہاری مغفرت نہ کرے گا، تمہاری توبہ قبول نہ کرے گا جیسا کہ بنی اسرائیل کے اس عابد نے گنہگار سے کہا تھا کہ اللہ تیری مغفرت نہ کرے گا۔ ٹھیک اسی کے مشابہ یہ بات بھی ہے کہ خروج کے بغیر اللہ تعالیٰ توبہ قبول نہ کرے گا، معاف نہ کرے گا، فرق صرف اتنا ہے کہ بنی اسرائیل کے قصہ میں ایک مجتہد عابد نے صرف ایک فرد سے کہا تھا کہ اللہ تیری مغفرت نہ کرے گا، اور یہاں مولانا نے لاکھوں سے کہا کہ خروج کے بغیر اللہ توبہ قبول نہ کرے گا، نہیں کہا جاسکتا کہ بلا دلیل ایسی شرط لگانا اللہ تعالیٰ کو کس قدر ناپسند ہوگا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو سچی توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔

واقعہ یہ ہے کہ قبولیت توبہ کے تعلق سے چوتھی شرط خروج کے ضروری ہونے کا دعویٰ کرکے مولانا نے خطرناک قسم کی غلطی کی ہے، مزید برآں تمام اسلاف واکابر علماء کے متعلق یہ کہہ دینا کہ اس چوتھی شرط کو لوگ بھول گئے اس میں کتنا بڑا الزام اور کیسی گستاخی ہے اکابر واسلاف کی شان میں، اور کتنا بڑا دعویٰ ہے اپنی علمی قابلیت کا، جب کہ ان کا یہ دعویٰ کتاب وسنت اور محدثین کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں مولانا سے ایسی بڑی غلطی ہوئی ہے کہ اس کی وجہ سے اولاً تو ان کو اللہ سے توبہ واستغفار کرنی

چاہئے، دوسرے لاکھوں کے مجمع میں قرآن وحدیث کے خلاف جس طرح یہ مضمون بیان کیا ہے اسی طرح لاکھوں کے مجمع میں اپنی اس غلطی کو واضح کر کے اس سے رجوع کرتے ہوئے صحیح بات کو تفصیل سے بیان کریں، جس طرح سے مثلاً حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہ نے ایک عام مجمع میں وعظ میں ارشاد فرمایا کہ فلاں مسئلہ میں مجھ سے غلطی اور چوک ہوگئی تھی پھر اس کی وضاحت فرمائی، تدارک کے طور پر مولانا پر بھی واجب ہے کہ ایسا ہی کریں اور آئندہ ایسے اجتہاد اور ایسے مضامین کے بیان کرنے سے اللہ واسطے احتیاط برتیں۔

(۴) طبقاتی جوڑ کیا امت کو ذبح کرنے والا عمل ہے؟

لہر پور کے اجتماع میں حضرت مولانا سعد صاحب نے اپنے بیان میں ارشاد فرمایا :

''ہمارے یہاں طبقاتی جوڑ کا کوئی تصور نہیں، طبقاتی جماعت..... یہ امت کو جوڑنا نہیں امت کو ذبح کرنا ہے، میرے نزدیک مہمل بات ہے کہ ڈاکٹروں کا جوڑ، انجینئروں کا جوڑ، طبقاتی جوڑ، مسجد وار جماعت، یہ طریقہ امت کو ذبح کرنے والا ہے، خواص کے جوڑ کا بھی کوئی تصور نہیں، ہمارے مزاجوں میں خواص کو دعوت دینے کی اہمیت زیادہ ہوگئی ہے، کارکنان کا جمع ہونا یہ امت کے لیے نقصان دہ ہے، کارکنان کا جمع ہونا کام کی تنزلی ہے اور کارکنان کا بکھر جانا کام کی ترقی ہے۔ تمہاری عبادتیں عرش تک پہنچ جائیں، اور تمہاری عبادتیں اگرچہ بالکل مقبول ہوں اور ایسی ہوں جیسی کہ مطلوب ہیں لیکن قسم خدا کی خدا کی نصرت نہیں ہوسکتی جت تک امت میں اجتماعیت نہ ہو، کالے، گورے کی تفریق ختم نہ ہو۔

ہمارے یہاں طبقاتی جوڑ کا کوئی تصور نہیں بلکہ عتاب اور تنبیہ کا ذریعہ ہے، روساء مشرکین نے چاہا تھا کہ ہمارا جوڑ الگ ہو جائے تو ہم آپ کی بات سنیں گے، ہماری شرط یہ ہے کہ جب ہم خواص جڑیں تو یہ صحابہ صہیب، بلال نہیں آئیں گے.....آپ نے طے فرمایا اور اس کو لکھا گیا مہر بھی لگ گئی اور جوڑ شروع ہوا.....ادھر عبداللہ ابن ام مکتوم آگئے (پورا قصہ) آیتیں نازل ہوئیں عبس و تولی .....الخ حضرت علیؓ کو بلایا، وہ کاغذ لاؤ، پھاڑ دو.....تو یہ طبقاتی جوڑ عتاب اور تنبیہ کا ذریعہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال دار کی تشکیل غریب کے ساتھ کر دی، وائل بن حجر کو معاویہ صعلوک کے ساتھ کر دیا، وہ ننگے پاؤں تھے پیر میں جوتے بھی نہ تھے، حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، حضرت معاویہ نے برداشت کیا.....'' الخ

یہ حضرت مولانا سعد صاحب دامت برکاتہم کا اجتہاد ہے، جس پر وہ شدت سے قائم ہیں اور کام کو بھی انہوں نے اس رخ پر ڈال دیا چنانچہ اب اجتماعات میں طبقاتی جوڑ بالکل ختم کر دیا گیا، ورنہ پہلے ڈاکٹروں، انجینئروں، ریل والوں وغیرہ مختلف طبقات کے لیے ان کی سطح ان کی فکر اور ان کی ذہنی صلاحیت واستعداد کے مطابق باہتمام جوڑ ہوا کرتے تھے، لیکن مولانا نے ان سب کو ختم کر دیا۔ اور نہ معلوم صرف علماء کے خاص جوڑ کو کیوں باقی رکھا؟ کیوں کہ ان کے بیان کے مطابق تو خواص کے جوڑ کا بھی اسلام میں کوئی تصور نہیں، مولانا نے یہ اتنا بڑا اقدام محض اپنے اجتہاد اور عقل وفہم کی بنیاد پر کیا، کاش اپنے ہی بیان کردہ اصول، اجتماعیت ومشورہ کی

ضرورت واہمیت کے پیش نظر ارباب حل وعقد حضرت مولانا محمد رابع حسنی صاحب دامت برکاتہم، حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب وغیرہ جیسی شخصیات سے مشورہ کرکے یہ تبدیلی لاتے، جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ ان کے اس اقدام سے نئے، پرانوں، چھوٹوں، بڑوں کو سخت تشویش تھی اور ہے، اعتراضات بھی ہوئے ہیں، اور یہ سب چیزیں فتنہ کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔

احقر کے نزدیک مولانا کا یہ اقدام جوان کے ذاتی اجتہاد واستنباط پر مبنی ہے کتاب وسنت کی روح کے خلاف ہے جس کو وہ امت پر مسلط کرنے کی مسلسل کوشش میں ہیں۔ جب یہ بات متعین ہے کہ طریقۂ تبلیغ میں شریعت نے کسی خاص طریقہ کا پابند نہیں بنایا اور تبلیغ وجہاد ان احکام شرعیہ میں سے ہیں جن کی خاص شکل وصورت شریعت نے متعین نہیں کی بلکہ حالات کے اعتبار سے ہم کو اختیار دیا ہے، اس میں تغیر وتبدل وتخلف سب ممکن ہے، علماء کرام کی اس پر واضح تصریحات موجود ہیں۔

پھر مولانا کا اس کو غیر شرعی چیز کہنا اور طبقاتی جوڑ کو قرآن وحدیث کو روشنی میں غلط کہنا نہ صرف غلط بلکہ موردعتاب قرار دینا، اور اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مستحق عتاب ہونا، نیز آیت عبس وتولیٰ کا اس کو مصداق اور مدلول قرار دینا اور غیر معتبر تفسیر کا سہارا لے کر من مانے نتائج نکالنا اور اس پر پورا وثوق واعتماد کرنا اور امت پر اس کو مسلط اور نافذ کردینا کس حد تک درست ہے؟

سورہ عَبَسَ وَتَوَلّیٰ کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا نے جو کچھ بیان کیا احقر نے متعدد کتب تفاسیر دیکھیں مجھے کہیں نہ ملا بلکہ اس کے خلاف تصریحات ملی ہیں۔ انہوں نے عبداللہ بن ام مکتوم کو اس قصہ سے کیسے جوڑ دیا جب کہ دونوں واقعے الگ الگ ہیں۔ سورہ انعام کی آیت **وَلَاتَطرُدِالَّذِینَ** الخ کا شانِ نزول الگ ہے، اس میں عبداللہ بن ام مکتوم کے خاص قصہ کو جوڑنا بھی غلط ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روساء مشرکین کی بات کو مان لینا، کاغذ پر لکھوا دینا، مہر لگوا دینا، اور طبقاتی جوڑ کا شروع ہوجانا، پھر حق تعالیٰ کا عتاب ہونا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت علیؓ کو بلانا اور کاغذ منگوا کر پھاڑ وا دینا مجھے کسی معتبر تفسیر میں نہیں ملا بلکہ اس کے خلاف تصریحات ملی ہیں جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

سورہ عبس کا شان نزول علامہ ابن کثیرؒ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی اہم شخصیات عتبہ، ابوجہل، ابی بن خلف وغیرہ کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے، اور ان کے اسلام کے لالچ میں ان سے گفتگو فرما رہے تھے کہ اتنے میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم قرآن پاک کی کوئی آیت سیکھنے کے لیے حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے **یا رسول اللہ عَلِّمْنِیْ** کہ اے اللہ کے رسول مجھے سکھائیے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ ابھی یہ تھوڑا ٹھہر جائیں تاکہ میں ان کی تبلیغ سے فارغ ہوجاؤں، حضرت عبداللہ بن ام مکتوم اصرار فرما رہے تھے اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طبعی طور پر تھوڑی ناگواری ہوئی، اسی موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں، ابن کثیرؒ نے ان روایات کو نقل فرمایا ہے۔ **عن ابن عباس قال بینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یناجی عتبة بن ربیعة وأباجهل بن هشام والعباس بن عبدالمطلب وکان یتصدیٰ لهم کثیراً ویحرص أن یؤمنوا فأقبل الیه رجل أعمی یقال له عبدالله بن ام مکتوم یمشی وهوینا جیهم فجعل عبدالله یستقرئ النبی**

صلى الله عليه وسلم آية من القرآن وقال يا رسول الله علمني ماعلمك فاعرض عنه رسول الله صلى الله عليه وسلم......ثم أنزل الله تعالىٰ عبس وتولى......قال ابن كثيرودّالنبی صلى الله عليه وسلم أن لو كف ساعته ليتمكن من مخاطبة ذالک طمعا ورغبة في هدايته. (ابن کثیر ج۴ رص ۴۷۰ رسورہ عبس پ۳۰ر)

اورآیت وَلَاتَطْرُدِالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِیِّ (سورہ انعام پ۷ر) کا قصہ اوراس کا شان نزول بالکل اس سے علیحدہ ہے جس کا حاصل علامہ ابن کثیرؒ ہی کی نقل کے مطابق یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب حضرت خباب، صہیب، بلال، وعمار رضی اللہ عنہم بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں جماعت قریش کی اہم شخصیات آپ کے پاس سے گزریں اور ان صحابہ کو حضور کے قریب بیٹھا دیکھ کر کہا کہ اے محمد کیا آپ کو اپنی قوم کے یہ لوگ اچھے لگتے ہیں اور آپ ان سے راضی اور خوش ہیں ؟ کیا ان کم درجہ کے لوگوں کے تابع ہوکر ہم بیٹھیں ؟ محمد! اپنے پاس سے ان کو ہٹا دیجئے تو ہوسکتا ہے ہم آپ کی بات مان لیں، اور آپ کی پیروی کریں، اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی وَلَاتَطْرُدِالَّذِیْنَ الآیۃ...... عن ابن مسعود قال مرّالملاء من قريش برسول الله صلى الله عليه وسلم وعنده صهيب وبلال وعمار وخباب وغيرهم من ضعفاء المسلمين فقالوا يامحمد أرضيت بهولاء من قومک، أهولاء الذين منّ اللّٰه عليهم من بيننا ، أنحن نصير تبعا لهولاء ؟اطردهم فلعک ان طردتهم أن نتبعک،فنزلت هذه الآيةوَلَاتَطْرُدِالَّذِیْنَ الآية. (ابن کثیر ج۲ رص ۱۳۴ رسورہ انعام پ۷ر)

ابن کثیرؒ کی مندرجہ بالاتفصیل سے معلوم ہوا کہ دونوں واقعے علیحدہ علیحدہ ہیں سورۂ عبس والے قصہ میں رؤساء مکہ پہلے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے اور آپ ان سے گفتگو فرمارہے تھے، عبداللہ بن ام مکتومؓ بعد میں حاضر ہوئے، اور آیت وَلَاتَطْرُدِالَّذِیْنَ میں صحابہؓ پہلے سے حضور پاک کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، رؤساء مشرکین نے آکر صحابہ کو دور کرنے کی خواہش ظاہر کی

مولانا کا یہ فرمانا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار ومشرکین کی خواہش کے مطابق طبقاتی جوڑ طے فرمادیا اوران کی خواہش کے مطابق اس کو کاغذ میں لکھ بھی دیا گیا مہر لگ گئی، پھر طبقاتی جوڑ شروع ہوگیا کہ اتنے میں عبداللہ بن ام مکتومؓ آگئے......وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات علامہ ابن کثیرؒ کی نقل کے مطابق صحیح نہیں۔

اولاً تو یہ قصہ ہی علیحدہ ہے، اس قصہ میں حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ آئے نہیں تھے، ان کے آنے والا قصہ دوسرا ہے، جس میں آپ کو ناگواری ہوئی تھی، مولانا کو خلط ہوگیا اور سورۂ عبس والے قصے کو اِس آیت کے قصہ سے جوڑ دیا، اور طبقاتی جوڑ کی مذمت پراس سے استدلال فرمایا۔ اولاً تو یہی بات غلط ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابہؓ ضعفاء مسلمین کو رؤساء مشرکین کی خواہش کے مطابق عملی اقدام بھی کرلیا تھا یعنی ان کمزور صحابہ کو اپنے سے جدا کرکے مشرکین رؤساء کے لئے علیحدہ نظام بنادیا تھا، اوراس کو کاغذ میں لکھ بھی دیا گیا، یہ بات ہرگز صحیح نہیں، مسلم شریف کی روایت اور قرطبی کی تفسیر سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ رؤساء مشرکین کے اسلام کے لالچ میں حضور پاک کے دل میں ایسا خیال ہوا کہ ایسا کرلیا جائے، آپ کا اس جانب کچھ رجحان اور میلان ہوا تھا لیکن آپ نے

ایسا کیا نہیں، اس کا وقوع نہیں ہوا، نہ معلوم مولانا کہاں سے یہ بیان کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کمزور صحابہ کو اپنے سے جدا کر کے طبقاتی جوڑ طے کر دیا، جوڑ شروع ہوا فوراً اللہ کی طرف سے عتاب نازل ہوا، آپ نے فوراً حضرت علیؓ کو بلوایا وہ کاغذ منگوایا اور اُس کو پھاڑ دیا گیا، یہ بات علاّمہ قرطبیؒ کی تصریح کے مطابق بالکل غلط ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک طرح کا اتہام والزام ہے کیونکہ آپ نے ایسا ہرگز نہیں کیا تھا، تفسیرِ قرطبی میں ہے : **انما مال الٰی ذالک طمعا فی اسلامھم و اسلامِ قومھم فمال الیہ فانزل اللّٰہ الآیۃ فنھاہ عماھمّ من الطرد لانہ اوقع الطرد. وروی مسلم فوقع فی نفس رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ماشاء اللّٰہ ان یقع تحدث نفسہٗ فانزل اللّٰہ عزوجلّ ولاتطرد الذین الآیۃ.**

(قرطبی ج۶ ص۲۷۸ سورۂ انعام پ۷)

علامہ قرطبیؒ صاف انکار فرما رہے ہیں کہ ایسا ہوا نہیں، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روساء مشرکین کے کہنے سے کمزور صحابہ کو اپنے سے جدا نہیں کیا تھا، البتہ آپ کو اس کا خیال ضرور ہوا اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے ایسا نہیں کیا۔

مولانا کا یہ فرمان بالکل غلط ہے کہ حضرت علی کو بلوا کر آپ نے لکھوا بھی دیا، مہر بھی لگوا دی.....ایک روایت (جس کو ابن کثیرؒ نے قبول نہیں کیا اس) میں صرف اتنا ذکر ہے کہ روساء مشرکین کے کہنے کی بنا پر آپ نے حضرت علی کو بلوایا، کاغذ منگوایا کہ اتنے میں وحی آ گئی تو آپ نے ایسا نہیں کیا یعنی لکھوانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ پھر یہ کہنا کیسے درست ہوا کہ آپ نے طے کر دیا، لکھوا دیا اور اللہ کی طرف سے عتاب ہونے کے بعد اس کو منگوا کر پھڑوا دیا۔

جس روایت میں حضرت علی کو بلوانے، کاغذ منگوانے کا ذکر ہے وہ روایت بھی قابل قبول نہیں، علامہ ابن کثیرؒ نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد اس پر کلام کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہو سکتی کیوں کہ یہ آیت یقیناً مکی دور کی ہے اور روایت میں جو قصہ منقول ہے وہ اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن سے متعلق ہے اور یہ لوگ ہجرت کے ایک عرصہ کے بعد اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ روایت ہی صحیح نہیں ہو سکتی اس لیے اس بنیاد پر مولانا کا اس روایت سے استدلال کرنا ہی بالکل غلط ہے۔

علامہ ابن کثیرؒ کی نقل کردہ حدیث اور مختصر عبارت ملاحظہ ہو! **قال : جاء الاقرع بن حابس التمیمی وعیینہ بن حصن الفزاری.....الی ان قال.....فاذا نحن فرغنا فاقعد معھم ان شئت قال نعم. قالو افاکتب لنا علینا کتابا قال فدعا بصحیفۃ ودعا علیا لیکتب ونحن قعود فی ناحیۃ فنزل جبرئیل فقال ولاتطرد الذین یدعون ربھم (الآیۃ) فرمی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بالصحیفۃ من یدٍ. قال ابن کثیر : وھٰذا حدیثٌ غریبٌ فان ھذہ الآیۃ مکیۃ والاقرع ابن حابس وعیینۃ انما اسلما بعد الھجرۃ بدھر.** (ابن کثیر ج۲ ص۱۳۵ سورۂ انعام پارہ ۷)

مذکورہ بالا تفصیلات سے اچھی طرح یہ بات واضح ہو گئی کہ طبقاتی جوڑ کا ان آیات اور اِن واقعات سے کوئی جوڑ نہیں یہ بالکل بے جوڑ بات ہے، اور مولانا کا اپنے مدعا پر ان آیات سے استدلال کرنا ہرگز صحیح نہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طبقاتی جوڑ پر

راضی ہو جانا اور اُس کی وجہ سے آپ پر عتاب ہونا یہ نعوذ باللہ آپ پر الزام واتہام ہے۔آپ نے ہرگز ایسا نہیں کیا تھا اور جس روایت میں تھوڑا بہت اس کا تذکرہ بھی ہے اُس کو ابن کثیر نے قبول نہیں کیا جس کی تفصیل ماقبل میں گزری، پھر اپنے دعویٰ کی مزید تقویت کے لئے وائل بن حجر اور معاویہ بن صعلوک کا قصہ بیان کرنا اور یہ کہ وائل بن حجر معاویہ بن صعلوک کو حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے بہت نامناسب بات ہے صحابہؓ کی شان میں گستاخی کا یہ دروازہ نہ کھلے تو اچھا ہے۔

افسوس تو یہ ہے کہ لاکھوں کے مجمع میں جب ایسے مضامین بیان ہوں گے تو یقینی بات ہے کہ دوسرے ہی روز سے لوگ اُس کو نقل کرنا بھی شروع کر دیں گے، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔علماء محققین نے تو سورہ عبس وتولی کے شانِ نزول اور عبداللہ بن ام مکتوم کے قصہ میں واضح طور پر یہ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ایک اجتہاد پر گئی تھی کہ اس وقت مَیں کفار وروساء مکہ کو اصول کی تبلیغ میں مصروف ہوں اور عبداللہ بن ام مکتوم فروعی بات پوچھنے آئے ہیں، اصول کی تبلیغ مقدم ہے فروع کی تبلیغ پر، پھر عبداللہ تو اپنے ہیں اور یہ کفار مشکل سے ہاتھ لگتے ہیں، یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد تھا اس لئے آپ نے اس وقت کفار کو ترجیح دی۔اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو باخبر کیا کہ یہ اجتہاد صحیح نہیں بلکہ طالب مقدم اور زیادہ قابلِ قدر وقابل توجہ ہے غیر طالب پر، عبداللہ بن ام مکتوم طالب بن کر آئے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو باخبر کیا۔

نیز عبداللہ بن ام مکتوم کا منتفع ہونا یقینی امر تھا اور کفار کا منتفع ہونا مظنون وموہوم تھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نفع موہوم کے مقابلہ میں نفع متیقن کو ترجیح ہوگی صرّح بہ الشیخ التھانویؒ الغرض اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اجتہادی خطاء پر متنبہ کیا گیا، طبقاتی جوڑ سے اس کا کوئی تعلق ہیں نہیں۔نہ معلوم مولانا نے کس بنیاد پر یہ اجتہاد کیا؟ حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ کے واقعہ سے متعلق ہمارے اکابر وعلماء محققین نے جو کچھ بیان فرمایا ہے، ان کی طرف تو مولانا کی نظر نہیں نہ ان کے مطالعہ کی ضرورت سمجھتے ہیں، ان کتابوں کا مطالعہ فرمالیتے تو ایسی غلطیوں کے شکار نہ ہوتے، اور اپنے طور پر اس نوع کے اجتہاد واستنباط کی جرأت نہ فرماتے۔

طبقاتی جوڑ اسلامی نقطۂ نظر سے سیرتِ نبویہ کے آئینہ میں

اسلامی نقطۂ نظر سے اصولی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو دعوت وتبلیغ جب ان احکامِ شرعیہ میں سے ہے جن میں شریعت نے کسی خاص طریقہ کا ہم کو پابند نہیں کیا، اور اس کی کوئی خاص شکل متعین نہیں کی تو حالات وضرورت کے لحاظ سے دعوت وتبلیغ کسی بھی نوعیت سے کی جاسکتی ہے، انفراداً بھی اجتماعاً بھی، طبقاتی جوڑ کے لحاظ سے بھی اور اس کے بغیر بھی۔خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی سیرت میں بکثرت ایسے واقعات ملتے ہیں کہ ضرورت وحالات کے پیشِ نظر آپ نے طبقات کے لحاظ سے لوگوں کو جوڑا، مسلم شریف کی روایت میں انصار نوجوان صحابہؓ کا مشہور واقعہ ہے جس کو حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی اپنی کتاب ''مختارات'' میں بھی نقل فرمایا ہے کہ :

(۱) ایک مرتبہ بعض نوجوان انصار صحابہؓ کو خلجان ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے مقابلہ میں اپنے خاندان والوں کو مال تقسیم کرنے میں ترجیح دی، یعنی ان کو مال زیادہ دیا، اس وقت ضرورت کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہتمام سے صرف انصار صحابہؓ کو ہی جمع کیا تھا اور اہتمام فرمایا تھا کہ کوئی دوسرا نہ آئے۔ کیونکہ ضرورت وحالات کا تقاضہ یہی تھا **جمع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الانصار فقال أفیکم أحدمن غیرکم الخ.** (مسلم شریف ج۱رص ۳۳۸ رکتاب الزکوٰۃ حدیث ۲۴۳۶ ر)

(۲) نیز ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض موقعوں پر صحابہ کے ایک طبقہ سے جو تجارت سے تعلق رکھتا تھا اسی طبقہ کو مخاطب بنا کر خصوصی ہدایات فرمائیں کیوں کہ وہ ان ہی کی ضرورت کی تھیں'' آپ نے فرمایا:

"یامعشر التجار! إن الشیطان والاثم یحضر ان البیع فشوبوا بیعکم بالصدقہ وفی روایۃ آخر "یا معشر التجار فاستجابوا لرسول اللّٰہ ﷺ ورفعوا اعناقھم وابصارھم الیہ فقال انّ التجار یبعثون یوم القیامۃ فجاراً الا من اتقی اللّٰہ وبرّ وصدق" (ترمذی شریف، کتاب البیوع، باب۴، حدیث ۱۲۲۴، ۱۲۲۸، ص ۵۳۱)

(۳) مسلم شریف کی کتاب الزکوٰۃ میں روایت موجود ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے ایک مرتبہ صرف قراء کو جمع کیا اور ان میں کچھ باتیں بیان فرمائیں، یہ خواص کا اجتماع اور طبقاتی جوڑ تھا، **بُعث أبو موسیٰ الأشعری الٰی قراء أھل البصرۃ فدخل علیہ ثلاث مائۃ رجل الخ.** (مسلم شریف ج۱رص ۳۲۵)

(۴) بخاری ومسلم اور مؤطا مالک میں طاعون کے باب میں حضرت عمرؓ کا قصہ مذکور ہے کہ وہ ایک دینی مہم میں جارہے تھے ،معلوم ہوا وہاں طاعون پھیلا ہوا ہے، آپ نے طبقاتی انداز میں مشورہ کیا اور طبقاتی انداز میں پہلے مہاجر صحابہ کو جمع کیا اور ان سے مشورہ لیا، پھر انصار صحابہ کو جمع کیا اور ان سے مشورہ کیا، پھر اخیر میں مشائخِ قریش کو جمع کیا اور فیصلہ کیا۔ **فقال عمر ادع لی المھاجرین الاولین فدعوتھم فستشارھم ثم قال ادع لی الأنصار فدعوتھم لہ فستشارھم،ثم قال ادع لی من کان ھھنا من مشیخۃ قریش الخ .** (مسلم شریف ج۲رص ۲۲۹ رباب الطاعون)

(۵) محدثین کے کلام سے بھی ضرورت کے وقت طبقاتی تقسیم ثابت ہے، چنانچہ احادیث مبارکہ کی روشنی میں محدثین نے اسی مقصد کے لئے مستقل باب منعقد فرمایا ہے۔ امام ابوداؤدؒ نے کتاب الادب میں باب منعقد کیا ہے **بابٌ فی تنزیل الناس منازلھم،** کہ لوگوں کے ساتھ ان کے رتبہ ودرجہ اور ان کی لیاقت وصلاحیت کے اعتبار سے برتاؤ کرو، اس کے تحت حدیث پاک ذکر کی ہے **"قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انزلوا الناس منازلھم"** (بذل المجہود ج۵رص ۲۴۷)

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ لوگوں کو ان کے درجہ کے موافق رکھو اور ان کے رتبہ کے مطابق ان سے برتاؤ کرو، اس میں گفتگو، کلام، خطاب، برتاؤ سب شامل ہے۔

(۶) امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں سند صحیح کے ساتھ یہی مضمون نقل فرمایا ہے، جس سے طبقاتی تقسیم کی

ضرورت واضح طور سے معلوم ہوتی ہے، اوراس کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے فتنہ کی خبر دی ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں :

ماانت بمحدث قوماحدیثالاتبلغه عقولهم الاکان لبعضهم فتنة. (مسلم شریف ج۱رص۹)

علامہ شبیراحمد عثمانی رحمہ اللہ اس کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں:

وفیه دلیل علیٰ ان المتشابه لاینبغی ان یذکرعند العامة. (فتح الملہم ج۱رص۳۳۹)

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ متشابہات یعنی دقیق اور غامض مضامین عوام کے سامنے بیان نہ کیے جائیں، یعنی تم کسی قوم اور جماعت کے سامنے ایسی کوئی حدیث یا دینی مضمون بیان نہ کروجوان کی عقل وفہم سے بالاتر ہوورنہ وہ ان کے لئے یقیناً فتنہ کا باعث ہوگا۔ اس کے نتیجہ میں اللہ ورسول کی تکذیب لازم آئے گی، اس سے بھی طبقاتی تقسیم کی ضرورت واہمیت معلوم ہوتی ہے۔

(۷) حضرت امام بخاریؒ نے تو کتاب العلم میں اسی غرض سے ایک باب ہی منعقد کیا ہے کہ لوگوں اور قوموں کی فہم اوران کی صلاحیت کے اعتبار سے تقسیم کی جائے ’’**باب من خص با لعلم قوماًدون قوم کراهیة ان لایفهموا**‘‘ پھراس کے تحت امام بخاریؒ نے حضرت علیؓ کے حوالہ سے نقل فرمایاہے: ’’**حدثواالناس بمایعرفون أتحبون أن یکذب اللّٰه ورسوله**‘‘

اس کی شرح میں علامہ عینی رحمہ اللہ نے نقل فرمایاہے: ’’**المرادعلی قدرعقولهم**‘‘

(عمدۃ القاری ج۲رص۲۰۵، فتح الباری ج۱رص۲۹۸)

ان سب کا حاصل یہی ہے کہ لوگوں کی عقل وفہم اوران کی فطری صلاحیت ولیاقت کے اعتبار سے ان سے گفتگو کرو، اور یہ یقینی بات ہے کہ عقل وفہم کے اعتبار سے لوگوں کے مختلف درجات وطبقات اور مختلف حالات ہوتے ہیں، اس لئے ضرورت کے وقت طبقاتی تقسیم ایک ضروری اور لازمی چیز ہے۔

(۸) اور دعوت وتبلیغ کے سلسلہ میں ندوۃ العلماء کا جو مسلک ہے اس کی تو بنیاد ہی اسی اصول پر ہے، جس کے نتیجہ میں طبقاتی تقسیم لازمی ہے، چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

دعوت الی اللہ، اسلام کے محاسن وفضائل کی تشریح اور ذہن وعقل کواس کی حقانیت وصداقت پر مطمئن کرنے میں اس کا عمل اس حکیمانہ وصیت پر ہے ’’**کلّموا الناس علی قدرعقولهم أتریدون ان یکذب اللّٰه ورسوله**‘‘ (کاروانِ زندگی حصہ اول ص۱۴۲)

(۹) اسی حقیقت کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی کتاب ’’المرتضیٰ‘‘ میں بھی حضرت علیؓ کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے، جس سے طبقاتی جوڑ کی ضرورت واہمیت معلوم ہوتی ہے، فرماتے ہیں: **عن علی قال: ’’کلمواالناس علی قدرعقولهم أتریدون ان یکذب اللّٰه ورسوله‘‘** (المرتضیٰ مصنفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ص۲۸۹)

(۱۰) یہی وجہ ہے کہ بانیِ تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے اپنی تبلیغی جماعت میں طبقاتی جوڑ اور طبقاتی انداز میں بھی کام کرنے کو بڑی اہمیت دی، اوراس کی خصوصی تاکید بھی فرمائی، چنانچہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا ایک طویل مکتوب نقل فرمایا ہے جس میں مولانا تحریر فرماتے ہیں :

''ہر ہر قوم کی الگ الگ جماعت بنانے کی میں بہت دن سے تاکید کر رہا ہوں، اس جلسہ میں ضروری تھا کہ موضع ''نئی'' سے ہر ہر قوم سے مستقل جماعت نکالنے کی پوری کوشش کرنے کے لئے ایک جماعت دو چار دن کے لئے مقیم کر کے آنا تھا، جو ہر قوم سے الگ الگ جماعت نکال کر آتی''۔ (مکاتیب مولانا شاہ محمد الیاس صاحبؒ ص ۱۳۱)

وجہ اس کی یہ ہے کہ لوگوں کی فکری ذہنی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں مسلکِ ندوہ کے مطابق دعوت الی اللہ اور فضائل کی تشریح میں ذہن وعقل کو پیشِ نظر رکھنا حکیمانہ وصیت ہے، اور بالکل عقل ونقل اور فطرت کے مطابق ہے، کتاب وسنت اور اصولِ شرع، نیز سیرتِ نبویہ کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کہ حالات وضرورت اور لوگوں کی ذہنی وفکری صلاحیت کے لحاظ سے طبقاتی جوڑ لازم اور ضروری ہے، اس کو غلط وباطل اور حق تعالیٰ کے عتاب اور تنبیہ کا سبب قرار دینا کس حد تک درست ہے خود غور کر لیا جائے۔

ہمارے اسلاف واکابرِ تبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ، مولانا انعام الحسن صاحبؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ وغیرہم کے وقت میں طبقاتی جوڑ ہوا کرتے تھے، کوئی اس کو غلط، مستحقِ عتاب وعذاب نہ سمجھتا تھا، لیکن مولانا نے ساری باتوں سے سے آنکھیں بند کر کے اپنے اجتہاد کی بنیاد پر طبقاتی جوڑ کو بالکل ختم کر دیا یہ کہہ کر کہ اسلام میں اس کا کوئی تصور نہیں، یہ حق تعالیٰ کے عتاب وتنبیہ کا ذریعہ ہے، حضرات اہل علم خود غور فرمالیں کہ کتاب وسنت اور اصولِ شرع کی روشنی میں یہ بات کس حد تک درست ہوسکتی ہے، اور اس پر ان کے بیان کردہ دلائل اور اجتہاد کی کیا حیثیت ہے۔

ہم تو یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک انتظامی چیز ہے ضرورت کے وقت اس کو اختیار بھی کیا جا سکتا ہے اور ضرورت نہ ہونے کی صورت میں یا اس کے مضر اثرات مرتب ہونے کی صورت میں خاص حالات میں منع بھی کیا جا سکتا ہے، مدار ضرورت وحالات ہیں، دلائل کی روشنی میں، اسلامی تعلیمات کے خلاف کہہ کر، اسلامی تصور اور اسلامی نظریہ کے خلاف کہہ کر اور حق تعالیٰ کے عتاب وتنبیہ کا ذریعہ قرار دے کر غلط کہنا، ختم کرنا، منع کرنا، یہ سو فیصد غلط ہے۔

لیکن آج اسی پر اصرار ہے، اب اہل علم اور اربابِ حل وعقد کے لئے قابلِ غور بات ہے کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہئے۔

(۵) خلوت وعزلت امت کی اصلاح سے ناامیدی کا ذریعہ ہے

مولانا نے اپنی تقریر میں بیان فرمایا:

''اللہ کے راستہ میں نقل وحرکت تربیت وتزکیہ کا یقینی ذریعہ ہے جتنی نقل وحرکت ہوگی اتنی ہی تربیت ہوگی، تزکیہ ہوگا، خلوت وعزلت اصلاحِ امت سے مایوسی کا ذریعہ ہے، خلوت وعزلت مایوس کرنے والی چیز ہے، کسی عمل، اور کسی ریاضت وخلوت سے یہ امت خیر پر نہیں آسکتی، اس امت کے خیر ہونے کے شرط دعوت الی الخیر ہے اگر ساری امت پورے دین پر آجائے لیکن دعوت الی الخیر

پر نہ آئے تو خیر پر نہیں، راہب اس کو کہتے ہیں جو امت سے کٹ کر خلوت میں عبادت کرے۔

نقل وحرکت دین کے پھیلنے کا ضابطہ ہے اس کا کوئی متبادل نہیں، یہ قدیم سنت ہے اس کا کوئی بدل نہیں، اللہ نے یقین اور ماحول کی تبدیلی دعوت میں رکھی ہے، نقل وحرکت کا کوئی متبادل نہیں خروج میں تزکیہ ہے۔''

دوسرے موقع پر بیان فرمایا: ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خلوت وعزلت کو اختیار کیا، حق تعالیٰ سے مناجات کے لئے چلے گئے جس کے نتیجہ میں پانچ لاکھ اٹھاسی ہزار بنی اسرائیل مرتد ہو گئے۔''

مولانا کے اس بیان سے خلوت وعزلت، تصوف وخانقاہ، ریاضت ومجاہدہ (جس کی ضرورت مسلمات میں سے ہے اور خود حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کو جس کا بہت اہتمام تھا) کے متعلق امت کا ذہن کیا بنتا ہے، اور اہل تزکیہ وتصوف اور اہل خانقاہ سے کیسی بدگمانی اور دوری کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

(۶) خارجی لقمہ نہیں لیا جائے گا

مولانا نے لہر پور کے اجتماع میں لاکھوں کی مجمع میں بیان فرمایا:

(۱) ''خارجی لقمہ نہیں لیا جائے گا، حنفی مسلک میں خارجی لقمہ نہیں لیا جاتا ورنہ سب کی نماز فاسد ہو جائے گی، لقمہ اسی کا لیا جاتا ہے جو جماعت میں شریک ہو، وقت لگاتے نہیں، نہ گشت میں شرکت، نہ تعلیم میں شرکت، رائے دینے چل دیئے، تمہیں رائے دینی ہو تو جماعت میں شریک ہو جاؤ، خارجی لقمہ نہیں لیا جاتا۔ اسی طرح تمہارے کام میں جو شریک نہیں اس کی رائے قبول نہیں کی جائے گی۔''

(۲) ''امت کی مثال ماءِ جاری کی سی ہے کہ پانی جب تک جاری ہے تو پاکی وناپاکی کا کوئی مسئلہ نہیں وہ تو ناپاکی کو بھی پاک کر دے گا بہا کر لے جائے گا، پاکی ناپاکی کے سارے مسئلے رکے ہوئے پانی میں ہوتے ہیں، علماء کی مثال کنویں اور چشمہ سے دینا غلط ہے، حدیث پاک میں علماء کی مثال بادل کی سی آئی ہے جو گشت کر کے برسے۔''

(۱) قابلِ غور بات ہے کہ اس طرح کی تمثیلات اور اس طرح کے بیانات سے عمومی انداز میں امت کا ذہن کیا بنے گا، خارجی لقمہ نہیں لیا جائے گا، اس جملہ کا مطلب امت کیا سمجھے گی؟ یہی کہ جو علماء بھی اس کام سے عملی طور پر منسلک نہیں، وقت نہیں دیتے اگر وہ مسئلہ بھی بتلائیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی کریں، کتنے ہی خلوص سے نیک مشورہ بھی دیں تو ان کا لقمہ مت قبول کرو کیونکہ وہ اصل کام سے نہیں جڑے، علماء سے دوری اور بدگمانی پیدا کرنے اور توڑ پیدا کرنے والی بات مولانا نے بڑی قوت سے فرمائی ہے۔ چنانچہ ان کے انہیں بیانات کے نتیجہ میں بہت سے عوام الناس ایسے علماء سے بالکل بیزار اور دور ہو گئے جو عملی طور پر اس کام سے منسلک نہیں، پھر نہ ان کی تقریر سنتے، نہ ان کے درسِ قرآن میں شریک ہوتے نہ ان سے مسائل پوچھتے ہیں کیونکہ خارجی لقمہ سے نماز فاسد ہو جائے گی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ''کاروانِ زندگی'' میں اسی بات کا شکوہ کیا ہے کہ مولانا اس دعوت وتبلیغ سے متعلق کچھ ضروری مشورے اور ہدایات دینا چاہتے تھے لیکن خارجی لقمہ سمجھ کر ان کے مشوروں کو اہمیت نہیں دی گئی مولانا نے اس کا شکوہ کیا ہے۔ (کاروانِ زندگی ج ۱ ص ۳۱۶)

افسوس محترم مولانا سعد صاحب لاکھوں کے مجمع میں اسی کی نصیحت فرمارہے ہیں۔

دوسرے اصولی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو بھی مولانا کا یہ قیاس بھی درست نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ خارجِ صلوٰۃ شخص کا لقمہ لینا تو واقعی درست نہیں اس سے نماز فاسد ہوجائے گی، لیکن کیا اس کو مقیس علیہ بنا کر دعوت وتبلیغ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے باب میں یہ قیاس کرنا درست ہے جیسا کہ مولانا نے بیان کیا؟ حاشا وکلّا، کیونکہ قیاس تو وہاں ہوتا ہے جہاں نص موجود نہ ہو، نص کے ہوتے ہوئے قیاس کرنا بہت بڑی غلطی ہے، یہاں دعوت وتبلیغ کے اصول وضوابط، حدود وقیود اور آداب سے متعلق کتاب وسنت میں واضح نصوص موجود ہیں تو پھر قیاس کی کیا ضرورت نص کے ہوتے ہوئے قیاس کرنے کو تمام فقہاء واصولیین نے سختی سے منع کیا ہے۔

دوسرے قیاس کرنے میں مقیس اور مقیس علیہ کے درمیان مماثلت کا ہونا ضروری ہے وہ بھی یہاں مفقود ہے، نماز عبادت لعینہ اور مقصود بالذات ہے جب کہ دعوت وتبلیغ عبادت لغیرہ ہے اہل علم دونوں کا فرق اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ دونوں کے احکام بھی جدا گانہ ہیں، مثلاً نماز کے لئے طہارت شرط ہے دعوت وتبلیغ کے لئے نہیں، نماز کی حالت میں قبلہ رو ہونا ضروری ہے دعوت وتبلیغ میں نہیں، نماز کی حالت میں کسی سے گفتگو کرنے اور مخاطب بنانے کی اجازت نہیں ورنہ نماز فاسد ہوجائے گی، اور دعوت وتبلیغ میں گفتگو اور مخاطب بنائے بغیر دعوت وتبلیغ کو انجام ہی نہیں دیا جاسکتا۔ وہکذا، الغرض نماز اور دعوت وتبلیغ کے احکام میں بھی فرق ہے جب کہ قیاس کرنے میں مقیس اور مقیس علیہ کے درمیان مماثلت ومشارکت فی العلۃ ضروری ہے، کیونکہ قیاس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ نص نہ ہونے کی صورت میں اشتراکِ علت کی بناء پر حکم کا تعدیہ کیا جائے، آخر یہاں پر مقیس اور مقیس علیہ کے درمیان کون سی علت جامعہ ہے جس کی بناء پر مولانا نے دعوت وتبلیغ کو نماز پر قیاس کرکے خارجی لقمہ قبول نہ کرنے کی تاکید فرمائی؟

مولانا کا یہ قیاس نصوص کے بھی تو بالکل خلاف ہے کیونکہ قرآن وحدیث میں پورے اطلاق وعموم کے ساتھ نصوص موجود ہیں **تَأمُرُونَ بِالمَعرُوفِ وَتَنهَونَ عَنِ المُنكَرِ . وَأمُر بِالمَعرُوفِ وَانهَ عَنِ المُنكَرِ . بلغوا عنی ولو آیة . ألا فلیبلغ الشاهد الغائب . من رأی منکم منکراً فلیغیره بیده الخ وغیر ذلک** نصوص سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شرعی ضابطہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہر شخص دوسرے کو مخاطب بنا کر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرسکتا ہے، اس میں داخلی اور خارجی کا کوئی مسئلہ ہی نہیں، قرآن وحدیث میں دعوت وتبلیغ کا حکم اطلاق کے ساتھ دیا گیا ہے، قرآن کے مطلق حکم کو شرعی دلیل کے بغیر مقید اور خاص کرنا اصولاً صحیح نہیں، اور دعوت وتبلیغ کے مسئلہ کو نماز کے مسئلہ سے مربوط کرنا اور اس کو مقیس علیہ بنا کر قیاس کرنا دنیا کے کسی فقیہ کے نزدیک درست نہیں اور نہ ہی آج تک بظاہر کسی نے یہ غلطی کی ہے، یہ تو نہایت غیر عاقلانہ بات ہے جس کو مولانا نے بیان کیا کہ ''دعوت وتبلیغ میں خارجی لقمہ قبول نہیں کیا جائے گا'' جس کا عقل وشریعت سے کوئی واسطہ نہیں اللہ تعالیٰ امت کی حفاظت فرمائے۔

(۲) جو علماء ومشائخ تصنیفی وتالیفی، تدریسی یا تزکیہ نفوس کی خدمت انجام دے رہے ہیں وہ ماء جاری نہیں بلکہ ماء راکد ہیں سب خطرے میں ہیں ناپاکی کے دہانے پر ہیں، ماء جاری بنیں تو ناپاکی بھی پاک ہوجائے گی، خواہ وہ ماء جاری کتنا ہی متغیر ومتعفن ہوجائے، اوصافِ ثلٰثہ بھی بدل جائیں لیکن چونکہ وہ جاری ہے لہٰذا پاک ہے.....ایسی تمثیلات وبیانات سے مولانا علماء ومدارس اور مصلحین امت سے لوگوں کو کیوں کاٹ رہے ہیں، کیوں بدگمانی کے گناہ میں لوگوں کو مبتلا کررہے ہیں۔

علماء کی مثال ضرورت وحالات کے لحاظ سے کنویں کی سی بھی ہے اور بادل کی سی بھی ،متعدد احادیث میں عالم کی مثال چودھویں رات کے چاند کی آئی ہے جو بظاہر ایک مقام پر مستقر ہوتا ہے،لیکن آثار وفوائد اور انوار کے لحاظ سے نیز مخفی ومعنوی اور باطنی طور پر ایسے طریقہ سے گشت کرتا ہے کہ نظر بھی نہیں آتا اور اس طرح سارے عالم کو منور کرتا ہے۔**ان فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلة البدر علی الکواکب** (رواہ الترمذی،مشکوٰۃ کتاب العلم ص ۳۴)

عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی چودھویں کے چاند کی ستاروں پر۔

ابوسعید خدریؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نصیحت فرمائی تھی کہ لوگ تمہارے پاس دور دراز سے علم حاصل کرنے آئیں گے ان کا خیال کرنا گویا آپ نے ان کو کنویں کے مشابہ قرار دیا جس پر لوگ آ آ کر سیراب ہوں گے،**ان رجالا یأتونکم من اقطار الارض یتفقھون فی الدین فاذااتوکم فاستوصوابھم خیرا**. (رواہ الترمذی،مشکوٰۃ ج ۳۴)

نیز ایسے عالم کی جو اپنے مقام پر رہ کر فرائض سے فارغ ہوکر لوگوں کو دین سکھانے میں مشغول ہوجاتا ہے نوافل بھی نہیں پڑھتا بہت فضیلت بیان فرمائی ہے۔**فضل ھذا العالم یصلی المکتوبة فیعلم الناس الخیر الخ**. (مشکوٰۃ ص ۳۶،داری)

بہت سے محدثین نے اربابِ حدیث اور ان کے افادہ وافاضہ کو کنویں اور جاری چشمہ سے تشبیہ دی ہے، غلط باتوں اور غلط مضامین کے ذریعہ فیض پہنچانے کو کڑوے اور کھارے چشمے سے تشبیہ دی ہے۔**حمادبن زیدیقول لرجل بعدماجلس مھدی بن ھلال بایام ماھذہ العین المالحة ؟**. (مسلم ج ۱ ص ۱۸) معلوم ہوا کہ علماء کو کنویں اور چشمہ سے تشبیہ دینے کا احادیث سے ثبوت ہے اور محدثین کا معمول بھی رہا ہے۔لیکن مولانا اس کو غلط کہتے ہیں اور علماء کو گشت کرنے والا بادل بنانے پر مصر ہیں۔

(۷) حالت قومہ میں دعاء پڑھنے پر اصرار

مولانا سعد صاحب دامت برکاتہم امت کو نماز میں خشوع وخضوع پیدا کرنے پر بہت زور دیتے ہیں اور زور دینا بھی چاہئے ،حضرت شیخؒ نے فضائل نماز میں ایک پوری فصل اسی کے متعلق تحریر فرمائی ہے،لیکن مولانا خشوع وخضوع پیدا کرنے کے لئے زیادہ زور اس پر دیتے ہیں کہ رکوع ،سجدہ،قومہ،سب بہت طویل ہونا چاہئے رکوع وسجود میں تسبیحات زائد تعداد میں پڑھنی چاہئیں،حالتِ قومہ میں حدیث پاک میں جو دعاء آئی ہے اس کو ضرور پڑھنا چاہئے ،مولانا کے نزدیک خشوع فی الصلوٰۃ کا یہی معیار ہے،اپنی مختلف تقریروں میں اسی کو بیان کرتے اور اسی پر اصرار کرتے ہیں،مختصر قومہ اور مختصر رکوع وسجود والی نماز کو خشوع کے خلاف سمجھتے ہیں اور اس پر نکیر کرتے ہیں،ایک تقریر میں مولانا نے پوری قوت اور وضاحت سے فرمایا جس کو احقر نے خود سنا کہ :

''مجھے تعجب ہوتا ہے ان ائمہ پر جو رکوع سے کھڑے ہوتے ہیں اور حالت قومہ میں اس دعاء کو جو حدیث پاک میں آئی ہے نہ خود پڑھتے ہیں اور نہ دوسروں کو پڑھنے کا موقع دیتے ہیں،حدیث پاک میں جو دعاء آئی ہے یہ ہے:

اللھم ربنا لک الحمد ملأ السموات وملأ الارض وملأ ماشئت من شیء بعد اھل الثناء و المجد الخ. بعض روایات میں اور دوسرے الفاظ آئے ہیں۔

مولانا کا خود بھی اس کے مطابق عمل ہے اور اس دعاء کے پڑھنے کی لوگوں کو تلقین بھی فرماتے اور نہ پڑھنے والے ائمہ پر تعجب

اورنکیر بھی فرماتے ہیں، مولانا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک خشوع فی الصلوٰۃ کا معیار صرف طول قومہ طول رکوع وسجود ہی ہے، بس اسی پر زور دیتے ہیں اور تعدیل ارکان کو (جو کہ ضروری بھی ہے) بھی اسی پر موقوف سمجھتے ہیں اور **صلّ فانک لم تصلّ** وغیرہ سے اس کو مدلل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ ساری باتیں مولانا کا اجتہاد و استنباط ہیں یا کسی دوسرے مسلک کی ترجمانی ہے جب کہ ہمارے فقہاء و محدثین نے احادیث مبارکہ کی روشنی میں خشوع کی یہ تشریح نہیں فرمائی جس کو مولانا بیان فرماتے ہیں حضرت ملاعلی قاریؒ وغیرہ کی تصریح کے مطابق خشوع کا تعلق ظاہر سے بھی ہے اور باطن سے بھی، اعضاء و جوارح سے بھی اور قلب سے بھی، خشوع کے لئے ضروری ہے کہ نماز کے جملہ ارکان ٹھیک ٹھیک سنت کے مطابق ادا ہوں، مکروہاتِ صلوٰۃ سے اجتناب ہو، مستحبات کا اہتمام ہو، ''مرقاۃ'' میں ہے: **(وخشوعها) بـاتيـان كل ركن على وجه هو اكثر تواضعاً واِخباتاً، اَو خشوعها خشية القلب، واِلزام البصر موضع السجود، وجمع الهمّة لها، والاعراض عما سواها، ومن الخشوع أن يتوقى كف الثوب والالتفات والعبث والتثاوب والتغميض ونحوها وهو يكون فى الظاهر والباطن الخ.** (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، کتاب الطہارت، ص۱۱، ج۲، حدیث ۲۸۶)

اسی طرح تعدیل ارکان کے کےتحقق کے لئے بھی مولانا طول قومہ اور طول رکوع وسجود پر اصرار کرتے ہیں حالانکہ شراح حدیث اور فقہاء کی مذکورہ بالا تصریح کے مطابق تعدیل ارکان کا یہ معیار نہیں ہے، تعدیل ارکان کے لئے مولانا جس دعاء کے پڑھنے پر اصرار کرتے ہیں وہ بھی صحیح نہیں، اس دعاء کے متعلق شراح حدیث اور فقہاء کی تصریحات وفتاویٰ نہایت اختصار کے ساتھ عرض کئے جاتے ہیں جس سے بات بالکل واضح ہوجائے گی کہ مولانا کا فرمان کہاں تک درست ہے۔

تعدیل ارکان اور قومہ میں دعاء پڑھنے کے متعلق فقہاءٔ محدثین کی چند تصریحات وفتاوی

(۱) فـي البـدائع : واما اذا كان اماماً فينبغي أن يسبح ثلاثاً ولا يطول على القوم لما روينا من الاحاديث، ولأن التـطـويـل سبـب التـنـفـيـر وذلك مـكـروه ...ويقول فى السجود سجد وجهى الخ وهو عندنا محمول على النوافل. (بدائع الصنائع ج۱ ص۴۸۸)

(۲) واذا رفـع (اى مـن الـركـوع) قـال الـلـهـم ربـنـا لك الحمد... الخ. وعند ابى حنيفة و محمد ذلك كله محمول على التطوع والتهجد فان الأمر فيه واسع ويؤيده ماثبت فى صحيح أبى عوانة وسنن النسائى أنه عليه السلام كان اذا قام يصلى تطوعاً قال الله اكبر وجهت الخ. فيكون مفسراً لما فى غيره. (کبیری شرح منیۃ المصلی ص۲۶۴)

(۳) اللهم ربنا لك الحمد ملأ السموات الخ . اى يزاد فى النوافل. (مرقاۃ شرح مشکوۃ ج۲ ص۵۵۱)

(۴) وجلس كل مصل بين السجدتين .وليس فيه ذكر مسنون والوارد فيه محمول على التهجد. (مراقی الفلاح ص۲۸۴)

(۵) ثم يرفع رأسه من ركوعه مستمعاً ويكتفى به الامام . (شامی ج۱ ص۳۶۷)

(۶) فان كان اماماً يقول سمع الله لمن حمده وهو الصحيح . (عالمگیری ج۱ ص۷۴)

(۷) وتطويل القومة والجلسة الذى ذكره انس ابن مالک فى حديثه . لم يأخذ من الائمة جمهورهم الا الظاهرية ، فلعله كان ذلک فى ابتداالأمر حين كان يطول صلوٰته ثم أمر بالتخفيف بعده او فعل هذا فى الصلوة النفل . (بذل المجہود شرح ابوداود ج ۲ ص ۶۹ / ہندیہ)

(۸) تعديل الاركان أى تسكين الجوارح قدر تسبيحة فى الركوع والسجود وكذا فى الرفع منها. .فيمكث فى الركوع والسجود وفى القومة بينهما حتى يطمئن كل عضو منه. (درمختار، شامی ج ۱ ص ۳۴۳)

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا فتویٰ

سوال ۱۸۸: قومہ اور جلسہ کی بابت اسی رسالہ میں دعاء ماثورہ لکھی ہیں، اور مسلم کی حدیث کا حوالہ دیا ہے، اور امام صاحب فرائض میں منع فرماتے ہیں، اگر مناسب ہو تو اس کی وجہ بھی ارشاد فرمائی جاوے۔

جواب : مقدمہ اولیٰ : فرائض میں اصل جماعت ہے۔

مقدمہ ثانیہ: بعض حدیث میں امام کو تخفیف صلوۃ کا حکم ہے۔

مقدمہ ثالثہ: ان اذکار میں تطویل مشاہد ہے پس مجموعہ مقدمات ثلثہ دلیل ہے حمل علی التطوع کی۔

اور تفصیل دونوں جوابوں کی مطولات میں ہے جس کو بقدر ضرورت اعلاء السنن میں نقل کیا ہے۔ (امداد الفتاوی ج ۱ ص ۲۰۱)

مذکورہ بالا فقہاء و محدثین کی تصریحات سے تعدیل ارکان کی حقیقت اور قومہ و بین السجدتین طویل دعاء ماثورہ کا حکم اچھی طرح واضح ہو گیا کہ امام اس دعاء کو قومہ میں نہیں پڑھے گا بلکہ اس کا تعلق نوافل اور تہجد سے ہے، نیز تعدیل ارکان کی حقیقت تسکین جوارح ہے، اور یہ دعاء ماثورہ پڑھنے پر موقوف نہیں۔ مذکورہ بالا تفصیل کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت مولانا سعد صاحب دامت برکاتہم کے اس فرمان کو جو انہوں نے بڑے مجمع کے سامنے بیان کیا کہ:

''مجھے تعجب ہوتا ہے کہ ان ائمہ پر جو قومہ میں خود بھی دعاء نہیں پڑھتے اور دوسروں کو بھی دعاء پڑھنے کا موقع نہیں دیتے۔'' یہ کس حد تک صحیح ہے۔

اور دعاء نہ پڑھنے پر نکیر کرنا کس حد تک درست ہے؟ ان کے اس بیان سے علماء و ائمہ سے کتنی بدگمانی اور مسئلہ کی کتنی غلط ترجمانی ہو رہی ہے، اس کا کیا حل ہے اور اب تک جو بیان ہو چکا اس کے تدارک کی کیا صورت ہونی چاہئے یہ محل غور ہے۔

(۸) خروج و نفیر اللہ کا حکم ہے، نہ نکلنا اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے

مولانا نے اللہ کے راستے میں نکلنے کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''اللہ کے راستے میں نقل و حرکت کی کمی اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے، تبلیغ میں نکلنے کا مقصد اگر یہ سمجھتے ہو کہ نمازیں درست ہو جائے تو غلط ہے، اللہ کے راستے میں نکلنا خود اللہ کا امر ہے، جب نکالا جائے نکل جاؤ، **انفروا خفافاً الخ** نفیر عام کا حکم ختم ہو گیا لیکن مطلق نفیر کا حکم ختم نہیں ہوا، غزوہ تبوک میں تین صحابہؓ نکلنے سے رہ گئے تھے، پورے مدینے میں ان سے کوئی بات کرنے والا نہ تھا یہ

سب امت کو بتلانے کے لئے کہ نقل وحرکت کی کمی اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے۔نقل وحرکت مغفرت کا یقینی ذریعہ ہے،اللہ کے راستہ میں بحری سفر میں جس کی موت کا وقت آجائے اس کی روح فرشتے نہیں اللہ خود نکالے گا،انبیاء کی روح فرشتے نکالیں گے لیکن اللہ کے راستے میں بحری سفر میں نکلنے والے کی روح اللہ تعالیٰ نکالے گا۔یہ بات ذہن سے نکال دو کہ یہ سارے فضائل قتال و جہاد کیلئے ہیں، نہیں یہ سارے فضائل اللہ کے راستے میں خروج کے لئے ہیں.فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً .الآية"

مولانا نے اپنے اس بیان میں کئی دعوے اور کئی ایسی باتیں بیان فرمائی ہیں جو محلِ غور،قابلِ تحقیق وتنقیح اور بعض بالکل غلط ہیں، مولانا نے نفس نکلنے ہی کو مقصود قرار دیا گویا یہ خروج وسائل میں سے نہیں، بلکہ مقاصد میں سے ہے، یہ فکری غلطی ہے،دوسرے اِنْفِرُوْا خِفَافاً الخ آیت سے استدلال کرتے ہوئے نفیر عام کا حکم دینا بھی صریح غلطی ہے اور قرآن پاک کی اس آیت سے یہ بات سمجھنا اور اس کا مصداق قرار دینا معنوی تحریف ہے، جہاد کرنا (جب کہ اس کے شرائط پائے جائیں) عام حالات میں فرضِ کفایہ ہے، البتہ بعض خاص حالات میں جس کو فقہاء نے بیان کیا ہے فرضِ عین بھی ہوجاتا ہے جس میں غلام آقا سے پوچھے بغیر بھی نکل جانے کا مکلّف ہے،اسی کو نفیر عام کہتے ہیں غزوۂ تبوک میں ایسے ہی حالات تھے۔ان آیتوں کو جو خالص جہاد بمعنی قتال اور جہاد کی خاص صورت سے متعلق ہیں اس دعوت وتبلیغ پر منطبق کرنا اور نہ نکلنے والوں کو اس وعید کا مصداق قرار دینا کھلی ہوئی تحریف اور گناہِ کبیرہ ہے۔

جہاد وقتال کے سارے فضائل دعوت وتبلیغ میں نکلنے والوں کے لئے ہیں، یہ بات بھی ایک حد تک تو صحیح ہے علی الاطلاق صحیح نہیں،اور جس حد تک صحیح ہے اس کا مصداق صرف دعوت وتبلیغ میں نکلنے والے ہی نہیں بلکہ طلبہ علم،مسئلہ پوچھنے اور فتویٰ لینے کے لئے نکلنے والے،کسی مریض کی عیادت میں جانے والے اور نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں جانے والے یہ سب اللہ کے راستے میں ہیں اور یہ سب خروج فی سبیل اللہ کی فضیلت کے مصداق ہوں گے،اس کو اس انداز سے بیان کرنا کہ بس سارے فضائل دعوت وتبلیغ میں نکلنے والوں ہی کے لئے ہیں بڑی غلطی ہے،اسی طرح جہاد وقتال کے سارے فضائل کا مصداق قرار دینا بھی علی الاطلاق صحیح نہیں، درمیان میں مولانا نے فرمایا غلو کہتے ہیں حق کے انکار کو، یہ بھی غلط کہا،غلو کہتے حدود سے تعدی کو جس کو مولانا کر رہے ہیں۔

(۹) چند متفرق باتیں

اسی سفر میں مولانا نے ندوہ کی مسجد میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا :

میرے نزدیک علم وذکر ایک ہی ہے، جو علم ہے وہ ذکر ہے،علم ہی ذکر ہے،دلیل میں فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ الخ آیت پڑھی۔مولانا کا یہ دعویٰ اور استدلال ایک نہیں بہت سی آیاتِ قرآنیہ واحادیثِ نبویہ اور مفسرین ومحدثین کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے،تفصیل کے لئے ایک پورے مقالہ کی ضرورت ہے۔

مولانا نے اسی تقریر میں سارے طلباء کو اس پر زور دیا اور ذہن بنایا کہ تجارت، دعوت، تدریس تینوں کام ایک ساتھ کرو تدریس بغیر اجرت کے ہو، بلا تنخواہ کے پڑھاؤ،معاش کے لئے تجارت کرو،مولانا کی یہ بات بھی قلتِ مطالعہ،قلتِ تجربہ اور اکابر کے دینی رجحانات اور ان کی فکر سے بے خبری پر مبنی ہے۔

تنخواہ لے کر پڑھانا نہ مکروہ ہے نہ خلاف افضل واولیٰ، نہ ہی دیانت اور خلوص کے منافی، ہمارے اکابر کی تحقیق وہدایت تو یہی

ہے کہ تنخواہ لے کر ہی پڑھاؤ، ضرورت نہ ہو تب بھی تنخواہ لو بعد میں رسید کٹا دو، بغیر تنخواہ کے پڑھاؤ گے تو نفسِ وشیطان کا شکار ہو جاؤ گے، آئے دن ناغہ کرو گے، پڑھانے میں کوتاہی کرو گے، بغیر مطالعہ کے پڑھاؤ گے، نصاب پورا نہیں کرو گے، اور نفس پٹی پڑھائے گا کہ فی سبیل اللہ پڑھاتا ہوں، لوگ بھی چشم پوشی کریں گے اور یہ شخص کوتاہی کرنے کے ساتھ عجب و کبر میں مبتلا ہوسکتا ہے، یہ ہمارے اکابر کی رائے ہے، لیکن مولانا کے پیشِ نظر یہ ساری باتیں نہیں ہیں اس لئے سارے طلباء کا ذہن یہی بنا رہے ہیں کہ بغیر تنخواہ کے پڑھاؤ اور پڑھانے کے ساتھ تجارت کرو، اور ان کے معتقدین سمجھتے ہیں کہ یہ ہے الہامی بیان، ہم لوگ اب تک غافل تھے کسی نے توجہ نہیں دلائی۔

غور کرنے کی بات ہے کہ علمی وتحقیقی اور تدریسی کام کے ساتھ کیا تجارت ہوسکتی ہے، یا تجارت کے ساتھ یکسوئی کے ساتھ تدریسی کام انجام دیا جاسکتا ہے ؟ تقسیم کار کا نقطۂ نظر تو خود قرآن نے بیان کیا ہے، معارف القرآن میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے تفصیل سے تحریر فرمایا ہے، ملاحظہ ہو معارف القرآن سورۂ توبہ پارہ ۱۱/ آیت فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ الخ اور حضرت تھانویؒ نے تدریسی کام کرنے والوں کو مستقلاً عملی طور پر تجارت کرنے سے سختی سے منع فرمایا ہے، اور اس کے نقصانات بتلائے ہیں، لیکن مولانا اسی کی ہدایت اور تاکید فرما رہے ہیں۔

مولانا نے اسی تقریر میں نوافل کے مقابلہ میں علمی اشتغال وانہماک کی فضیلت کا قوت سے انکار کیا، حالانکہ حدیث پاک میں ایسے عالم کی جو فرائض پر اکتفاء کرتے ہوئے ہر وقت تعلیم وتعلم میں لگا رہے ایسے عابد، شب بیدار کے مقابلہ میں ایسی فضیلت آئی ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت تمام صحابہؓ پر۔ (دارمی، مشکوٰۃ شریف ص ۳۶)

(۱۰) اکابرین امت کی خدمت میں مؤدبانہ گزارش

حضرت اقدس مولانا سعد صاحب دامت برکاتہم کے احقر نے صرف دو تین بیان ہی سنے ہیں ان میں جو باتیں احقر کو محل غور اور قابل اصلاح معلوم ہوئیں، اور یہ احساس ہوا کہ (ان کے بیانات سے امت کو دینی فوائد پہنچنے کے ساتھ) دین کی صحیح ترجمانی اور امت کی صحیح رہنمائی کے بجائے غلط ترجمانی، غلط رہنمائی، اور غلط ذہن سازی بھی ہو رہی ہے، جس سے دین کو اور امت کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے، عوام کا علماء ومشائخ سے اور تبلیغ کا مدارس وخانقاہوں سے رشتہ کمزور ہو رہا ہے، وہ اپنے بیانات میں غلط تفسیر، معنوی تحریف اور مسائل میں غلط بیانی نیز انبیاء وصحابہؓ کی شان میں بے اعتدالی کی باتیں بھی فرما جاتے ہیں۔ اس کی حفاظت وسدّ باب اور جو کچھ ہو چکا اس کا تدارک تمام علماء کرام کے ذمہ مجموعی طور پر فرض کفایہ ہے، اس سے قبل اسی نوع کی بعض باتیں احقر نے حضرت مولانا سعد صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں اٹھارہ صفحات پر مشتمل عریضہ کی شکل میں پیش کی تھیں، لیکن پورا کام اکابرین امت کی توجہ و نگرانی کا محتاج ہے۔

ضرورت کے پیش نظر اہل علم کی اطلاع کے لئے بطور نمونہ کے احقر نے صرف چند باتیں عرض کی ہیں جو احقر نے خود ان کے بیان میں سنیں، ان کے دیگر بیانات جو مختلف بڑے اجتماعات میں ہوتے رہتے ہیں اگر ان سب کا جائزہ لیا جائے تو نہ معلوم کتنی باتیں افراط وتفریط کی راہ حق اور اعتدال سے ہٹی ہوئی سامنے آئیں گی۔ خدانخواستہ کسی کی ذات پر حملہ نہیں، کسی شخصیت سے ذاتی بغض و

عناد اور حسد نہیں بلکہ مسئلہ صرف دین کی اور امت کی حفاظت کا ہے، اس کے لئے اکابرین امت ارباب حل وعقد کی خدمت میں احقر کی عاجزانہ گزارش ہے کہ اپنی تمام دینی مصروفیات کے ساتھ اس امر کی طرف بھی توجہ فرمائیں۔ احقر کی ناقص رائے کے مطابق ضروری معلوم ہوتا ہے کہ امت میں انتشار اور تبلیغی کام کو نقصان سے بچانے کے ساتھ ساتھ کوئی مناسب تدبیر اختیار کی جائے۔ مثلاً ارباب حل وعقد اور اکابرین امت کے زیر نگرانی معتمد علماء کرام ان کے بیانات کا پوری دیانت داری کے ساتھ جائزہ لیں اور قابل اصلاح باتوں کو مرتب کر کے اکابرین امت کے واسطہ سے موصوف کی خدمت میں اہتمام سے بھیج دیا کریں تا کہ آئندہ وہ ایسی باتوں اور ایسے بیانات سے احتیاط کریں، اور جو کچھ بیان کر چکے ہیں اس کے تدارک کی فکر کریں، علماء محققین مثلاً حضرت تھانویؒ کی کتابوں کا بھی مطالعہ کریں تا کہ آئندہ ایسی غلطیوں سے محفوظ رہیں، اور اگر اس بار کو اٹھانے کی برداشت نہ ہوا اور ایسی ہمت نہ کر سکیں اور اس امانت کی حفاظت کما حقہ ان کے قابو سے باہر ہو تو اس امانت کی حفاظت کے جو اہل ہوں ان کی نگرانی میں اور ان کے مشورہ ہی سے کام کریں۔

الغرض اس کام کی حفاظت کی طرف توجہ کی شدید ضرورت ہے ایسا نہ کرنے کے نتیجہ میں ڈر لگتا ہے کہ وسیع پیمانہ پر جب ایسی بے اعتدالی کی باتیں (جن کا اوپر تذکرہ ہوا) لاکھوں کے مجمع میں بیان ہوں گی اور وہ رائج بھی ہوں گی تو خدانخواستہ یہ مفید جماعت اور اس کا عظیم الشان کام جو ہمارے لئے نعمت ہے، ناقدری اور بے توجہی اور حفاظت نہ کرنے کے نتیجہ میں کہیں مصیبت وابتلاء کا شکار نہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔

نوٹ: اللہ نے توفیق دی تو مزید باتیں اسی نوعیت کی ان شاء اللہ آئندہ عرض کی جائیں گی۔

والسلام

محمد زید مظاہری ندوی

استاذِ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۱ر جمادی الثانی ۱۴۳۶ھ